جلد ۸۹ — مئی ۱۹۷۸ء — عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

KTM/ 6-77

SCAN

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۹ | مئی ۱۹۷۸ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ــــــ ۴۱۱۰۱۶ ــــــ ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بیس روپے ۔ فی پرچہ ۲/ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم

۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو وہ سانحہ پیش آیا جو پاکستان کے تمام اہلِ علم واہلِ دین کے لیے، جماعت اسلامی کے رفقاء اور ہمدردوں کے لیے، قارئین ترجمان القرآن کے لیے اور ذاتی طور پر خود میرے لیے ایک صدمۂ عظیم تھا۔ اُس روز اس مجسمۂ خیر انسان نے وفات پائی جو ایک سچے مسلمان کی زندگی کا نمونہ تھی۔ اس روز اُس خادمِ دین نے وفات پائی جس نے اپنی زندگی کے پورے ۳۵ سال اسلام کی خدمت میں بسر کر دیے۔ اس روز وہ شخص دُنیا سے اُٹھ گیا جو دین و دُنیا کے علوم کا جامع تھا اور جس کے قلم سے اُردو اور انگریزی میں وہ تحریریں نکلیں جو انشاء اللہ رہتی دُنیا تک طالبینِ حق کو نفع پہنچاتی رہیں گی۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

میرے لیے مرحوم دست و بازو کا حکم رکھتے تھے ۱۹۵۷ء کے آخری زمانے سے لے کر اپنے آخری مرض تک وہی ترجمان کے اشارات لکھتے رہے۔ انہوں نے اِس حد تک مجھے اس رسالے کے بارے سے سبکدوش کر دیا کہ میں اپنی خرابی صحت کے طویل دَور میں تفہیم القرآن کو مکمل کر سکا ورنہ بیک وقت دونوں کاموں کا بار اُٹھانا میرے لیے مشکل تھا۔ اس طرح میں نے جو کچھ بھی تھوڑی بہت دین کی خدمت کی ہے اس کے اجر میں بھی وہ میرے ساتھ شریک ہیں اور اپنی دینی خدمات کا اجر تو وہ پورا پورا خود ہی پائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اُن کو اپنے صالح بندوں میں شامل کرے اور انہیں آخرت میں وہ اجر عطا فرمائے جو اُس نے متقین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔

ابوالاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۱)

وہ شمعِ فروزاں جس نے مسلسل ۲۶ سال تک ترجمان القرآن کی محفلِ اشارات کو روشن رکھا، سال ڈیڑھ سال ٹمٹانے کے بعد آخر گل ہوگئی۔

ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام!

گوجرانوالہ سے ۴، ۵ میل شمال کی جانب بستی فیروز والہ میں، ۱۰ اپریل کو ساڑھے چار بجے شام نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی سات صفوں کے سامنے اس شخص کی میت رکھی تھی جسے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے علم وایمان کا یہ آفتاب قبر کی گہرائی میں غروب ہوگیا۔ اب وہاں صرف مٹی کی ایک ڈھیری یہ بتانے کے لیے موجود ہے کہ یہاں محوِ خواب ہے وہ شخص جس نے کتنی ہی خوابیدہ روحوں کو جگایا ہوگا۔

ڈیڑھ سال قبل فالج کا حملہ ہوا تھا، لیکن ایک مخلص معالج کے علاج کی مدد سے اس اسیبی مرض کے شکنجے سے اُن کے اعصاب آہستہ آہستہ رہائی پاتے چلے گئے اور ایک بار پھر وہ پبلک لائبریری میں کئی برس سے اپنی مخصوص شدہ نشست پر بیٹھ کر ترجمان القرآن کی ادارت اور قرآن وحدیث کے انگریزی تراجم کا کام کرنے میں محو ہو گئے۔ مگر گذشتہ عیدالاضحیٰ کے قریب اُن پر مرض کا پھر حملہ ہوا۔ دل کا دورہ ہو یا فالج کا حملہ، ان جانکاہ بیماریوں کا دوسرا حملہ خطرناک ہوتا ہے۔ کم ہی لوگ بچ نکلتے ہیں۔ اسی حملے کا مقابلہ ادویہ اور نفسیاتی تدبیروں سے کیا جاتا رہا اور آنے والا حادثہ ٹلتا رہا۔ گویا موت تقدیر کی کمین گاہ میں ایک طرف بیٹھی مریض اور معالج کی واماندگیٔ تدبیر کا تماشا کرتی رہی۔ آخر وہ بامرِ الٰہی ۱۰ اپریل کی صبح کو تین بجے کے قریب آئی اور چار بجے جھپٹی۔ آخری سانس نکلی اور

اُدھر مؤذن کی پکار سُنائی دی ـــ اللہ اکبر، اللہ اکبر!

اور عبدالحمید صدیقی کی شخصیت در روح اُس دن دار البقاء کو جانے والے قافلے کی صفِ اوّل میں شامل ہو کر خطِ افق کے اس پار چلی گئی۔ اعزہ و احباب روتے چلاتے رہ گئے اور مرحوم کی بیوہ اور بچیاں مژگانِ حیات کے آنسو بن کر رہ گئیں۔

میرے ذہن میں یکایک قرآن کی وہ دردناک مگر بشارت سے لبریز آیت گونجنے لگی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر جیسے نفاست پسند نوجوان کی نعشِ مبارک کو خاک و خون میں پڑے دیکھ کر پڑھا تھا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب ۲۳)

ترجمہ:- ایمان والوں میں ایسے مردانِ کار شامل ہیں جنہوں نے اللہ سے باندھے ہوئے پیمان کو سچ کر دکھایا۔ پس اُن میں سے کوئی وہ ہے جس نے اپنی ذمہ داری کا (آخری سانس تک) حق ادا کر دیا۔ اور کوئی وہ ہے جو (ادائے فرض کے لمحۂ تکمیل کا) انتظار کر رہا ہے۔

الفائے عہد تو جیتے جی حضورؐ پر ایمان لانے والے سارے ہی خوش نصیب مسلمان کر رہے تھے، مگر حق تو ادا جبھی ہو سکتا ہے کہ آدمی آخری لمحے تک ایمان کے تقاضوں کو پورا کر دکھائے۔ درمیان میں قدم قدم پہ صدہا رہزن، ہزار ہا چور جذبے اور کید شیطانی کے صد ہزار پھندے حائل ہیں جن کی وجہ سے کتنے ہی علم و تقویٰ کے خزانہ بردار ایک ذرا سے ہیر پھیر میں پڑ کر عمر بھر کی کمائی لٹوا بیٹھتے ہیں۔ کردار کی اُونچی چوٹیوں تک ہانپ ہانپ کر برسوں کی محنت سے پہنچنے والے لوگ دل کے کسی کھوٹ، نگاہ کی کسی خیانت، کمائی میں حرام کی آمیزش، ذہن میں کبر و کینہ کی کسی لہر اور معاملات میں ظلم کے کسی اقدام کی وجہ سے پل میں نیچے پٹخ دیے جاتے ہیں، بلکہ بعض سے تو سطحِ زمین پر ٹکنے کا اعزاز بھی چھن جاتا ہے۔ اور وہ بیچارے اسفل السافلین میں پہنچ جاتے ہیں۔ اللّٰھم احفظنا جمیعًا۔

ہمارے بھائی عبدالحمید صدیقی خدا سے باندھے ہوئے پیمانِ وفا کو تا دمِ آخر نبھا گئے، اور انہوں نے تقاضائے ایمان سے ذرا انحراف نہیں کیا۔ (وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ الاحزاب ۲۳)۔

صدیقی صاحب اور ہم سب کے گرد جو دُنیا پائی جاتی ہے وہ ہمیشہ ایمان و مفاد کا میدانِ کشمکش رہی ہے لیکن جب سے اس پر مادہ پرستانہ تہذیب کا غلبہ ہوا ہے، لوگوں کے سینوں میں گویا صنمِ دولت کے مندر تعمیر ہو گئے ہیں۔ انبوہ کے انبوہ روپے کی تسبیح پڑھتے ہوئے معیارِ زندگی بڑھانے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے اپنی قوت صرف کر رہے ہیں۔ بادۂ نفسانیت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ ترقی نام کی ساحرہ کندھوں پر سوار ہے۔ پیچھے سے ادنیٰ خواہشات غیر مرئی نیزوں کی انیاں چبھو چبھو کر رفتار بڑھانے پر مجبور کرتی ہیں، سامنے اسباب آرائش و آسائش کی ایک جنت دکھائی دیتی ہے۔ اس دوڑ میں عقیدے پامال ہو رہے ہیں۔ اخلاقی حدود اور قانون کے جنگلے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ اصول، روایات اور اقدار کے ٹکڑے الگ الگ ہو کر گر رہے ہیں، حلال کی کٹھن راہوں کو چھوڑ کر حرام کی آسان پگ ڈنڈیوں کو اختیار کیا جا رہا ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں یہ ماحول جو معمولی سے معمولی درجے کے ایمان اور مسلک شرافت کے لیے سخت ناسازگار ہو گیا ہے، اس میں دوہری تہری آزمائش ہے اُس قافلہ بلاکشاں کے لیے جو معاشرے کا پورا نقشہ تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ ------- تمام الحاد پسند، تمام مغرب پرست، تمام اشتراکیت زدہ، تمام انحراف پسند اور تمام بڑے بڑے مفاد پرست عناصر، تبدیلی چاہنے والے علمبردارانِ اسلام کے خلاف علمی، صحافتی، سیاسی اور ادبی محاذوں سے برسرِ جنگ ہیں۔ اور وہ تمام اداروں اور ذرائع و وسائل کے دروازے ان پر بند کیے ہوتے ہیں جن پر ان کی اجارہ داری قائم ہے اور اگر کوئی پہلے سے اندر آگیا ہو تو یہ عناصر اسے دھکیل باہر کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو معاشرے نے قلیل سے معاوضے کی جو پروفیسری دے رکھی تھی وہ بھی اس بنیاد پر واپس لے لی کہ ع

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہی دوہری تہری آزمائش پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو درپیش تھی۔ ہمارا یہ مخلص رفیق نہایت غریبانہ حالات کے ساتھ اُٹھتا ہے اور زندگی کی ابتدائی منزلِ شعور ہی میں اپنا رشتہ تحریک اسلامی کے قافلۂ بلاکشاں سے استوار کر لیتا ہے۔ نہایت درجہ مشکل مالی حالات میں وہ باطل نظریات کے خلاف صبر و ثبات سے معرکہ آرا رہتا ہے۔ اس پورے معرکے میں نہ کبھی اس کی نگاہ دولت کے شعبدوں پر جاتی ہے، نہ اربابِ جاہ کے ایوانوں میں سائل بن کر داخل ہوتا ہے، نہ اُس کے قدموں کو یہ احساس حرکت سے روکتا ہے کہ اپنی ذات کے علاوہ بیوی اور بچیوں کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہے۔ اگر زندگی کے تقاضے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں تو وہ اپنی دماغی مزدوری کی مقدار بڑھا دیتا ہے۔ دنیا کے دوسرے معاشروں میں دماغی محنت خاصے ثمرات دیتی ہے، لیکن یہاں تو اگر کوئی شخص سال بھر

میں ایک اچھی کتاب لکھے تو اُس کی خوش قسمتی ہو گی، اگر بیس سال میں اُسے اپنے ایک سال محنت کے مصارف مل جائیں۔

ایک شخص جس نے غریبانہ حالات کے باوجود، اپنے ایمانی معرکے کو شروع سے آخر تک یاں احوال جاری رکھا کہ بھاری محنت کر کے جائز راستوں سے بمشکل اسے گذر بسر کے لیے روزی حاصل ہو سکی، اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے خدا سے باندھا ہوا پیمانِ وفا پورا کر دکھایا۔

پروفیسر صدیقی علی الصباح گوجرانوالہ سے بابو ٹرین (ملازمین اور مزدوروں کو لاہور لانے والی گاڑی کا عوامی نام) میں ہر روز لاہور آتے[1]، اسٹیشن سے پبلک لائبریری پہنچتے اور دن بھر کام کرتے۔ ملاقات کرنے والے رفیقوں اور عہدوں پر فائز پرانے شاگردوں، اور اپنے قدر دان دوستوں اور ناشرین کو وقت اور توجہ سے حصہ دیتے، پھر بھی وہ بہت کچھ پڑھ بھی لیتے اور لکھ بھی لیتے۔ آخری چند سالوں میں تو جبکہ مضمحل صحت کی وجہ سے ہفتے میں دو چار دن وہ لاہور ہی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ بیک وقت کئی بھاری بھرکم کام کر رہے تھے۔ میں اُن کے متعلق وہی بات کہوں گا جو کسی موقع پر اپنے متعلق کہی تھی کہ" میرا دماغ میرے جسم کو کھا رہا ہے"۔ بالکل اسی طرح برادرم حمید صدیقی کے حسّاس اور تخلیقی دماغ نے ان کی جسمانی قوتوں کو نچوڑ لیا تھا۔ آخر مادہ کے بنے ہوئے دماغی خلیات ان کی کاوشوں اور نگارشوں، ان کے ذاتی مسائل اور ملک میں تیس سال تک اسلام اور جمہوریت اور شرافت اور امن اور انسانی حقوق کے خلاف اُٹھنے والے نت نئے طوفانوں کے کرب کا سہ گونہ بوجھ کہاں تک برداشت کرتے۔

انجام کار یہ لمحہ آگیا کہ علم کے پھول اور حکمت کے موتی جس دماغ سے فضاؤں میں بکھر رہے تھے، اس کی مشین چلتے چلتے یکسر جام ہو گئی۔

پروفیسر عبدالحمید مرحوم نے ایک بڑی قربانی دے کر وہ خدمات انجام دیں جن سے نہ صرف آج ہم استفادہ کر رہے ہیں، بلکہ آئندہ نسلوں کے لاکھوں افراد کو اُن سے حصہ ملے گا۔

---

[1] ایک روایت کے مطابق خود ان کا کہنا تھا کہ تاروں کی چھاؤں میں گھر سے نکلتا ہوں اور تاروں کی چھاؤں میں گھر پہنچتا ہوں، بچے اُس وقت بھی سو رہے ہوتے ہیں، اور اِس وقت بھی۔

سیاسی اکھاڑے میں اُترنے کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ، مگر اس میں کشش (CHARM) بھی زیادہ ہے۔ آدمی کتنا ہی بے لوث ہو، اس کا ذہن اس دائرے میں آنے کے بعد اس کی جاذبیتوں کے اثر سے بچا نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا اسٹیج پر آکر بسا اوقات ہزارہا افراد کے مجموعوں کو مخاطب کرنا، اُن کے ذہنوں میں نفوذ پا جانا، اُن کے دلوں میں گھر کر لینا، اُن کو کمانڈ کرنا، تقریروں اور بیانوں کا اخبارات میں چھپنا اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کی لہروں کے ذریعے دُور دُور تک منتقل ہونا، کیمروں کے شیشوں کا عشاق کی بے تاب آنکھوں کی طرح ہر طرف سے گھیر لینا، خواص و عوام کے وفود کا ملنا، انٹرویو لیے جانا، اہم شخصیتوں سے روابط، خود اپنے حلقۂ رفقا میں اس کام کی قدر و قیمت کا اوّل درجے پر ہونا، اور خیراندیشوں کی طرف سے پروجیکٹ کرنے کی مہم، دعوتیں اور ضیافتیں اور استقبالیے، یہ سارا کچھ کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ برادرم پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم جب پروفیسری کر رہے تھے تو میں سیاسی اکھاڑے میں تھا۔ (۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۲ء) اور خدا کے فضل سے کسی لحاظ سے کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ اُس وقت کی مخالف فضا اور مشکل حالات میں شاید میرے حصے کا فریضہ زیادہ ہی سخت تھا۔ بعونہٖ تعالیٰ بخوبی عہدہ برآ ہوا۔ میں اس کم گو اور انکسار پسند آدمی کو دیکھتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ یہ صاحبِ مطالعہ و کاوش رفیق فکری سرد جنگ میں ہمہ تن لگ جانے کے بجائے سیاسی گرم جنگ میں بھی حصہ دار بنے اور خود میرے لیے ذاتی طور پر ایک اچھا ساتھی ہو، مگر عبدالحمید صدیقی مرحوم اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہے۔ میرے سامنے کتنے ہی اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں رکھنے والے ادیبوں نے اپنی برسوں میں بنی ہوئی ادبی شخصیتوں کی قبائیں اُتاریں اور انتظامی عہدے سنبھال لیے۔ کیونکہ اپنے دائرے میں سیاست کاری، تقریر و خطابت اور انتظامی عہدہ داری کے مقابلے میں ادب تو تھا ہی خس و خاشاک کی طرح، اچھے خاصے علمی کام کرنے والوں کو بھی ویسی اہمیت نہ حاصل ہوسکی۔ ایسی فضا میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کا اس عزم پر جم جانا کہ وہ براہِ راست سیاسی لڑائی لڑنے والوں سے الگ دُور بیٹھ کر حکمت، افکار و تصورات اور دلائل و براہین کے اسلحہ تیار کریں گے، بہت بڑی بات ہے۔ ظاہری داد و ستد تو سیاسی محاذ کے جرنیلوں کو ملتی ہے، سارے خطابات اور تمغے ان کے لیے ہوتے ہیں۔ دُور کسی تہ خانے میں بیٹھ کر گولہ بارود تیار کرنے والے کو بہت دیر تک اعلیٰ درجے کا کام کرنے کے بعد بس دھیمی قسم کا ایک احترام حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے (اور شاید ایک آدھ بار میرے ترغیب دلاتے کے باوجود) انھوں نے گوشۂ تنہائی میں کیے جانے والے اپنے خاموش کام کو نہ چھوڑا۔ یہ ایک طرح کی قربانی ہے اور بہت بڑی قربانی ہے، اور اسی کا ماحصل یہ ہے کہ آج ہمارے پاس مرحوم کے

قلم سے رقم شدہ متعدد کتابیں سیرت، تاریخ اسلام، فلسفہ، تاریخ، تعلیم اور مغربی تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر انگریزی اور اردو میں موجود ہیں۔ ریاض الصالحین اور مشکوٰۃ اور مسلم شریف کے تراجم انگریزی میں کیے۔ انگریزی زبان میں انہوں نے قرآن کا ترجمہ مع تفسیری حواشی کے تیار کرنا شروع کیا اور غالباً بارہ پاروں تک کا کام ہو چکا تھا۔ (جن میں سے ۸ پارے شائع ہو چکے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ارضی زندگی کے دورِ امتحان کو ختم کر دیا۔ علاوہ ازیں بہت سے مضامین کا انگریزی زبان سے ترجمہ کیا۔ بے شمار کتابوں پر تبصرے لکھے، ترجمان القرآن کے سیکڑوں اشارات خوبصورت علمی انداز میں لکھتے ہوئے دینی حقائق کی روشنی میں سیاسی احوال کا ناقدانہ تجزیہ کیا۔ یہ ایک مستقل مدرسہ تھا جس کے تحت ہر ماہ ہزاروں قارئین کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر پروفیسر عبدالحمید صدیقی پارلیمانی ممبر ہوتے بلکہ وزیر بن جاتے تو دینی علم اور فکر صالح کا یہ سدا بہار گلشن آراستہ نہ ہو سکتا۔ یہ تو صدقہ جاریہ ہے۔ ایک چشمہ ہے جو ہمیشہ بہتا رہے گا۔ اور کھیتیاں اس سے سیراب ہوں گی۔ سیاست و صحافت میں معرکے انجام دینے والوں کو (اور انہوں نے بھی راہ حق کے لیے جو کام کیے اس کی بھاری جزا اُن کو ملے گی) اگر کبھی لوگ فراموش بھی کر دیں تو رفیق محترم عبدالحمید صدیقی اپنی کتابوں کے پیکر میں تا دیر لوگوں کے سامنے رہیں گے۔

غلبۂ حق کے لیے ان کی دماغی کاوشوں کو خداوند کریم قبول فرمائے اور اُن کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر میں غیر معمولی اثر بھر دے۔

میرے سامنے بہت سے احباب نے اظہار افسوس کرتے ہوئے اُن کی علمی خدمات کا ذکر کیا۔ مگر میری نگاہ میں ان خدمات سے بڑھ کر ایک چیز اور ہے جو مرحوم کی پیشانی کو آخرت میں نور پالش بنا دے گی۔

وہ تحریک اسلامی کے اخلاقی تقاضوں کے مطابق انسانیت کا پرکشش نمونہ تھے۔ میں خاص طور پر اس پہلو کا ذکر اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کہیں ہنگامہ ہائے نو بہ نو سے گذرتے ہوئے اس سے غافل نہ ہو جائیں۔ میرے نزدیک اسلامی شعور کے تحت کسی شخص میں سب سے پہلے دیکھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے کے لیے یہی پہلو ہے کہ اس نے رفیقوں اور رقیبوں کے ساتھ مختلف معاملات نبھاتے ہوئے پیچ در پیچ رابطوں کے جنگل کو کس طرح عبور کیا۔

تحریک اسلامی کا اگر کوئی تصوف ہو سکتا ہے تو مرحوم اس کا بہترین نمونہ تھے۔ احباب کے لیے محبت کیش، اغیار کے لیے بے ضرر، مفاد و عناد کے چکروں سے مجتنب، رشک و حسد اور کینہ و کدر سے محفوظ، (باقی بر صفحہ ۲۳)

تعزیراتِ اسلام

از جناب مولانا بشیر احمد قاضی باغ - آزاد کشمیر

(۷)

قصاص

باب اوّل:- قصاصِ نفس، یعنی جان کے بدلے جان -

فصل اوّل:- قتل عمد، ——— قصاص کی تعریف اور اس کا ثبوت -

دفعہ ۱ قتل کی تعریف -

ا - قتل سے مراد ——— کسی انسان کا ایسا فعل ہے جس سے انسان کی رُوح نکل جائے۔[۱]

ب - قتل عمد کی تعریف -

قتل عمد سے مراد ——— ایسا قتل ہے جو عمداً کسی ہتھیار سے کیا جائے یا کسی ایسی تیز چیز سے کیا جائے جو اعضاء کو کاٹنے اور جدا کرنے میں ہتھیار کے قائم مقام ہو۔[۲]

ج - قصاص کی تعریف -

قصاص سے مراد ——— عمداً قتل کرنے یا عمداً زخم پہنچانے کی ایسی سزا ہے جس میں مساوات اور مماثلت ممکن ہو۔

---

[۱] ھو فعلُ من العباد تزول بہ الحیاۃ - البحر الرائق ص ۳۲۶ ج ۸ - مطبوعہ دار المعرفۃ - بیروت -

[۲] ھو ان یتعمد ضربہ بسلاح وما یجری مجری السلاح مما لہ حد یقطع و یجرح - البحر الرائق ص ۳۲۷ جلد ۸ مطبوعہ بیروت -

تشریحات

تشریح ۱: قتلِ ناحق کی حرمت کا ثبوت قرآن سے:

۱۔ جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو مگر حق پر (الانعام : ۱۵۱)

۲۔ اور نہ مارو اُس جان کو جس کو اللہ (تعالیٰ) نے منع کیا ہے، مگر حق پر۔ اور جو مارا گیا ظلم سے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے، سو اُس کو قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

(الاسراء : ۳۳)

۳۔ اور نہیں خون کرتے جان کا جو حرام کر دی اللہ نے مگر حق پر (یعنی جب کہ قتل کرنے کا کوئی شرعی سبب پایا جائے)۔ (الفرقان)

۴۔ اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا تھا کہ جو شخص قتل کرے ایک جان کو، بلا عوض جان کے، یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا اُس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اُس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا۔ (مائدہ : ۳۲)

۵۔ اس کی حرمت حدیث سے:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ سوائے اللہ کے اور کوئی الٰہ نہیں ہے اور یہ کہ میں اس کا رسول ہوں، سوائے اُس آدمی کے جس کے اندر تین صفات میں سے کوئی ایک پائی جائے۔ (۱) شادی شدہ ہوتے ہوئے اس نے زنا کیا ہو۔ (۲) کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو (۳) دینِ اسلام سے مرتد ہو گیا ہو[1]

۶۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے فرمایا۔

"بیشک تمہارا خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں (ایک دوسرے پر) حرام ہیں[2]

۷۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی

---

[1] صحیح مسلم ص ۵۹ ج ۲ باب ما یباح بہ دم المسلم۔ مطبوعہ آرام باغ کراچی۔

[2] ایضاً ص ۶۱ ج ۲۔

مومن کے قتل پہ ایک لفظ سے بھی امداد کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا کہ "آئس من رحمتِ اللہ" یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے والا ہے۔[1]

۸۔ ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ ہر گناہ کو شاید اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں۔ لیکن شرک پہ مرنے والے اور عمداً قتل کرنے والے کو معاف نہ کریں گے"۔[2]

۹۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری دنیا کی تباہی ایک مسلمان کے قتل (ناحق) سے ہلکی چیز ہے۔

ایک روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مومن کے قتل ناحق میں شریک ہوجائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کریں گے"۔[3]

قرآن وسنت کی مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ ناحق قتل کرنا حرام ہے۔

نمبر ۲۔ اقسامِ قتلِ ناحق۔

قتلِ ناحق کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔ قتلِ عمد

۲۔ قتلِ شبہ عمد

۳۔ قتلِ خطاء

۴۔ قتل قائم مقام خطاء

۵۔ قتل بالسبب[4]

درحقیقت قتل عمداً اور خطاءً دو طرح کا ہی ہے۔ لیکن عمد اور خطا میں نقصان کی وجہ سے باقی قسمیں بن جاتی ہیں۔

اور مقتول کے احوال کے اعتبار سے عمد اور خطاء کی کل آٹھ صورتیں بنتی ہیں۔ کیونکہ مقتول چار ہی قسم کے آدمیوں میں سے کسی قسم کا ہوگا۔ (۱) یا مومن ہے (۲) یا ذمی ہے (۳) یا مصالح و مستأمن ہے (۴) یا حربی

---

[1] رواہ ابن ماجہ

[2] ابن ماجہ بحوالہ مظہری

[3] مشکوٰۃ کتاب القصاص ص ۳۰۲

[4] ہدایہ کتاب الجنایات۔

دشمن ہے۔ اور قتل بنیادی طور پر دو طرح کا ہے (یعنی عمداً و خطاءً)۔ پس اس اعتبار سے کل صورتیں آٹھ ہوئیں۔ (۱) مومن کا قتل عمد (۲) مومن کا قتل خطاء (۳) ذمی کا قتل عمد (۴) ذمی کا قتل خطاء (۵) مصالح مستأمن کا قتل عمد (۶) مصالح و مستأمن کا قتل خطاء (۷) حربی (دشمن کا قتل عمد (۸) حربی کا قتل خطاء۔

ان اقسام کے احکام مناسب مقامات پر ذکر کیے جائیں گے۔ یہاں صرف اجمالی طور پر ان کے احکام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت کا حکم سورۂ بقرہ میں مذکور ہے (یعنی قتل کے بدلے قتل)۔ دوسری صورت کا حکم اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ (الیٰ قولہ) وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ (النساء) میں مذکور ہے۔ تیسری صورت کا حکم حدیث دارقطنی میں ہے کہ ذمی کے عوض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے قصاص لیا (اخرجہ الزیلعی فی تخریج الهدایة)۔ چوتھی صورت کا حکم اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ " میں موجود ہے۔ پانچویں صورت کا حکم سورۃ النساء کے رکوع فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا" میں مذکور ہے۔ چھٹی صورت کا حکم چوتھی صورت کے ساتھ مذکور ہے کیونکہ میثاق عام ہے دائمی اور وقتی۔ پس ذمی اور مستأمن دونوں اس حکم میں آگئے۔ (درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں مستأمن کی دیت کے وجوب کی تصریح ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صورت کا حکم خود جہاد کی مشروعیت سے ثابت ہے۔ کیونکہ جہاد میں حربی یعنی اہل حرب (برسر جنگ دشمن) قصداً قتل کیے جاتے ہیں اور خطاءً کا جواز اَولیٰ ثابت ہوگا (ملخصاً از بیان القرآن۔ النساء)۔

تشریح ۳ - قصاص کا مفہوم۔

۱۔ قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے دوسرے پر کیا ہے اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لیے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ " یعنی تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر کی ہے"۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ۔ (النحل) (ترجمہ) اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا ظلم تمہارے اوپر کیا گیا ہے۔

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوا کہ قصاص اس سزا کا نام ہے جس کے اندر مماثلت پائی جائے۔

ب - قصاص میں مجرم اسی صورت میں قتل کیا جائے گا جب کہ اس نے جرم عمداً کیا ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے مَنْ قَتَلَ عَمَدًا فَهُوَ قَوَدٌ۔ [1] یعنی جو عمداً قتل کیا گیا ہو اس کے بدلہ میں قصاص کی سزا ہے۔

تشریح ۲ - قصاص کا ثبوت۔

ا - قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اور نہ مارو اس جان کو جس کو اللہ (تعالیٰ) نے حرام کیا ہے مگر حق پر، اور جو مارا گیا ظلم سے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔ سو وہ قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔"

(الاسراء : ۳۳)

۲ - "اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت۔ پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہیے موافق دستور کے۔ اور ادا کرنا چاہیے اس کو خوبی کے ساتھ۔ یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی۔ پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لیے ہے عذاب دردناک۔ اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو تاکہ تم بچتے رہو۔" (البقرہ : ۱۷۸ و ۱۷۹)۔

۳ - "اور ہم نے اُن پر (یعنی یہود پر) اس (تورات) میں یہ بات فرض کی تھی کہ جان بدلے جان کے، اور آنکھ بدلے آنکھ کے، اور ناک بدلے ناک کے، اور دانت بدلے دانت کے، اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔ پھر جو شخص اس (قصاص) کو معاف کر دے وہ (معاف کرنا) اُس (معاف کرنے والے) کے لیے کفارہ ہو جائے گا۔ اور جو شخص خدا (تعالیٰ) کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو وہی ظالم ہے۔"

(المائدہ : ۴۵)

قرآن حکیم میں جو سابقہ شریعتوں کے احکام موجود ہیں اُن کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اگر ہماری شریعت نے ان کو منسوخ کر دیا ہے تو وہ احکام ہمارے لیے قابلِ عمل نہیں ہوں گے ورنہ وہ ہمارے لیے واجب العمل ہوں گے۔[2]

---

[1] ابوداؤد باب عفو النساء عن الدم۔

[2] احکام القرآن ص ۱۳۵ جلد ا مطبوعہ بیروت۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

" اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ، فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ " (سورہ الانعام : ۹۰)

یعنی وہ لوگ تھے جن کو ہدایت دی (اللہ تعالیٰ) نے سو تو چل اُن کی راہ پر ،

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

" شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ " (سورہ الشوریٰ : ۱۳)

یعنی " راہ ڈال دی اللہ نے تمہارے لیے دین میں، وہی جو دیا تھا نوحؑ کو اور جو وحی کی ہم نے تم پر اور جو ہدایت کی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰ کو، اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین ، اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں"۔

لہٰذا جب قرآن میں پچھلی کتابوں کا حوالہ دے کر قصاص کا حکم دیا تو وہ منسوخ نہیں ہے بلکہ نافذ العمل ہے[1]۔

ایک شبہ کا ازالہ: سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت نمبر ۱۷۸، ۱۷۹ کو دیکھ کر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عورت کو اگر کوئی مرد قتل کر دے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو قاتل سے قصاص ساقط ہوگا، اس لیے کہ قرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں " القصاص فی القتلیٰ " کا جملہ مذکور ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے ، پھر اس کی وضاحت سورۂ مائدہ کی آیت سے مزید ہو جاتی ہے جس میں اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کا جملہ مذکور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کے بدلے نفس کو قتل کیا جائے گا۔ اس میں کسی نفس کی تخصیص نہیں ہے۔ قاتل خواہ مرد ہو یا عورت ، آزاد ہو یا غلام ، قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

شبہ کا منشا یہ ہے کہ آزاد کے بدلے آزاد ، اور غلام کے بدلے غلام ، اور عورت کے بدلے عورت کا ذکر ہے اور عورت کے بدلے مرد اور غلام کے بدلے آزاد کا ذکر موجود نہیں ہے۔ مگر یہ بات صرف اُس واقعہ کی بنا پر فرمائی گئی ہے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

---

[1] ولا نجد فی القرآن ولا فی السنۃ ما یوجب نسخ ذلک فوجب ان یکون حکما ثابتا علینا۔ احکام القرآن ص ۱۳۵ ج ۱۔

ابن کثیر نے ابن ابی الحاتم کی سند سے نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہوگئی تھی جس میں طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام عورتیں اور مرد قتل ہو گئے تھے۔ ابھی ان کے معاملے کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ اسلام کا دور آگیا۔ اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہوگئے۔ اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی تو ایک قبیلہ جو قوت اور شوکت والا تھا اُس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے مرد قتل نہ کیا جائے۔ ان کے اس جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبے کی تردید کے لیے یہ آیت نازل ہوئی وَالحُرُّ بِالحُرِّ وَالعَبدُ بِالعَبدِ وَالاُنثیٰ بِالاُنثیٰ۔ جس کا حاصل اُن کے اس مطالبے کو رد کرنا تھا کہ غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو۔

اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے۔ اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا، یا قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں۔[1]

---

[1] مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر ابن کثیر ص ۲۰۹ جلد ۱ مطبوعہ حلب

اسلامی معاشرے میں حق گوئی

سید اسعد گیلانی

اسلامی معاشرے میں حق گوئی کو جہاد اکبر قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی اور قابلِ قدر نیکی ہے اس لیے کہ اجتماعی زندگی کو پاک و صاف رکھنے اور معاشرے کی اخلاقی صحت کو بحال رکھنے کے لیے اسلامی تربیت کے ساتھ ساتھ تنقید و احتساب کا اہتمام بھی ایک نہایت ضروری کام ہے۔ حضورؐ اکرم نے اپنے قائم کردہ اسلامی معاشرے میں حق گوئی کو شعارِ عام بنانے کا خصوصی اہتمام فرمایا تھا۔ آپ نے احتساب کی روح کو خدا ترسی کے جذبے کے ساتھ منسلک کر کے اُسے ایک مثبت اور تعمیری قوت بنا دیا تھا۔ حضورؐ نے جو اسلامی معاشرہ قائم فرمایا اُس کی خصوصیات میں حق گوئی کو ایک بنیادی خصوصیت قرار دیا گیا۔ معاشرے میں مداہنت ایک گھٹیا صفت قرار پائی۔ حق گوئی کو جہادِ اکبر کہا گیا۔ صداقت کو چھپانا شیطان کا فعل قرار پایا۔ خرابی اور بدی کا تدارک ہر فرد کا انفرادی فریضہ ٹھہرایا گیا۔ ظلم و عدوان کے خلاف آواز بلند کرنا، حق پسندی کو فرد کی طبیعت کا جزو بنانا اور حق گوئی کو مسلکِ عام اور جزوِ ایمان سمجھنا، یہ ساری خوبیاں معاشرے کی اجتماعی تعلیم و تربیت کا حصہ قرار دی گئیں۔ حق کو چھپانے اور منکر پہ خاموش رہنے کو گونگے شیطان کا فعل کہا گیا۔ اور ایسے شخص کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگانے کی دھمکی دی گئی جو ظلم کے مقابلے میں کلمۂ حق بیان نہ کرے۔ غرض اسلامی معاشرے کا ضمیر اِس صفت پہ استوار کیا گیا کہ حق کی حمایت بہر حال کی جائے گی چاہے وہ دشمن کی طرف سے ہی ظاہر کیوں نہ ہو اور ناحق کی بہر حال مخالفت کی جائے گی چاہے وہ اپنے اندر ہی کیوں نہ پایا جائے۔

انسان کے اندر اس کا ضمیر معروف احکام کا پابند ایک نفسیاتی مقام ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرے

میں ضمیر کی آواز کے مطابق عمل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ ضمیر کو دبانا اور اس کے خلاف کام کرنا عنت درجے کی کم ظرفی اور فطرتِ انسانی کا گھٹیا مظہر تصور کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انسان کا ضمیر اُس کی نیکی کی داخلی آواز ہے۔ غریب اور مظلوم شخص کو دیکھ کر مدد اور رحم کا جو جذبہ انسان کے اندر اُبھرتا ہے اور اُس کی دست گیری کے لیے انسان کے دل میں جو تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص ضمیر کی آواز کو بار بار دباتا ہے تو در اصل وہ معروف اور نیکی کی آواز کو دبا کر اُسے بے زبان کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کا احساس ہی مردہ ہوتا چلا جاتا ہے اس لیے اسلام ضمیر کو دبانا نہیں اُبھارنا چاہتا ہے تاکہ نیکی کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی رہے جو بدی کے خلاف انسان کی داخلی مزاحمت کی بہترین قوت ہے۔

قرآن نے کہا

وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ (سورۃ قیامۃ:۱)

ترجمہ: اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی بُرائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

مزید بتایا گیا کہ انسان کے اندر نیکی بدی کا پیمانہ باقاعدہ انسانی ضمیر کی صورت میں ہی نصب کیا گیا ہے۔

فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا (الشمس)

ترجمہ: ہر نفس میں اُس کی بدی و نیکی کو الہام کر دیا گیا ہے۔

حضورؐ نے نیکی بدی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

"نیکی حسنِ اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک پیدا کرے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں"۔

اسی طرح ایک صحابی حضرت وابصہؓ سے نیکی اور گناہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا۔

" اے وابصہؓ اپنے دل سے پوچھا کر، اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر، نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بُن میں ڈال دے۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں"۔

ظاہر ہے کہ انسان کی یہ داخلی کیفیات اس کے ضمیر سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وہ خدا کا واعظ ہے جو انسان

کے اندر پہرہ دینے کے لیے بٹھایا گیا ہے تاکہ اُسے سیدھے راستے پر قائم رکھے اور دائیں بائیں کے بھٹکنے والے راستوں پر مڑ جانے سے روکے، اسی لیے فرمایا گیا تھا۔

"جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔"

حضورؐ نے مومن کو داخلی طور پہ اس طرز کی تعلیم دے کر اُسے حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت کرنے کے لیے تیار کیا اور اُسے ایک خاص سانچے میں ڈھالا جو باطل کے نقشے میں کبھی موزوں نہیں ہو سکتا۔ خالص مومن ہمیشہ اپنی فطرت کے زور سے ہی باطل کے خلاف کشمکش کرتا رہتا ہے۔ غرض جب مومن کا مزاج حق پسندی، حق طلبی اور حق پناہی کے سانچے میں پوری طرح ڈھل گیا تو پھر اُسے حق گوئی کا حکم دیا گیا۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ حضرت لقمان کی زبان سے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان:۲)

اچھی بات کا حکم دو اور بدی سے روک دو۔

مومنین کی معاشرے کے اندر یہ صفت بیان کی گئی۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)

وہ آپس میں حق کی نصیحت اور ثابت قدمی کی تلقین کرتے ہیں۔

مزید فرمایا۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (بلد: ۱)

وہ آپس میں ثابت قدمی اور مہربانی کی تلقین کرتے ہیں۔

بہ حیثیت جماعت ان کا یہ فریضہ قرار دیا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران: ۱۲)

تم سب سے بہتر اُمت ہو جو لوگوں کو اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بُری بات سے روکتے ہو۔

اسی لیے حضورؐ نے ہر ایک کو راعی (ذمہ دار) قرار دیا۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته

تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کی نسبت باز پرس ہوگی۔

اس طرح حق گوئی کو انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک معاشرے میں ایک رواں دواں خوبی کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا تاکہ اس کی مدد سے معاشرہ اپنے نظریاتی اور اسلامی موقف سے سرِمُو ہٹ نہ سکے۔ ہر قابلِ اعتراض شے کو ٹوکنے والی اور ہر تجاوز و ترمیم کو روکنے والی زبان ہر جگہ موجود ہو جو زندگی کا بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر بھی اس ترمیم و تجاوز و تحریف کی نشان دہی کرے۔ اسی لیے سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل الجہاد قرار دیا گیا اس لیے کہ سلطان جابر حق کے مقابلے میں ناحق کا پشتیبان بن جاتا ہے اور اس کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنے سے پورے معاشرے کے فرد فرد کے ضمیر میں قوتِ زندگی نمودار ہوتی ہے جو معروف کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انحطاط ایک معمولی سی کوتاہی کا مسلسل پرورش پاتے رہنا ہے اور پھر اس کی ممد و معاون کوتاہیوں اور خامیوں کا اس کے ساتھ ابھرتے چلے جانا ہے۔ اگر معاشرے میں یہ اہتمام ہو کہ ہر کوتاہی کو چاہے وہ کسی بھی مقام پہ ابھرے اسے روکا اور ٹوکا جائے تو جس طرح ایک باغ نلائی ہوتے رہنے سے سنورتا رہتا ہے لیکن اگر کسی باغ کی دیکھ بھال نہ ہو اور اس میں ہر جنگلی گھاس پودے اور جھاڑی کے لیے اُگنے پھیلنے پھولنے اور بڑھنے کی فضا سازگار موجود ہو تو وہ باغ ایک روز جنگل بن کر رہتا ہے۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں احتساب کا عمل جاری رہے تو معاشرہ اپنی اصلی اور حقیقی نظریاتی بنیادوں پر معیار کے مطابق قائم رہتا ہے اور اگر یہ عمل رُک جائے تو بگاڑ مختلف صورتوں میں نمودار ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے حق گوئی کو دنیا کے ہر معاشرے میں عموماً اور اسلامی معاشرے میں خصوصاً انتہائی قدر و منزلت کا بلند مقام شمار کیا گیا ہے اور جو لوگ حق گوئی کے نتیجے میں مصائب سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ انسانی نے انھیں اعلیٰ اخلاقی مراتب پر فائز شمار کیا ہے۔

بنی اسرائیل کے انحطاط اور اخلاقی تنزل کا ذکر فرماتے ہوئے حضورؐ اکرم نے صحابہ کرام کی مجلس میں فرمایا۔

> "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں بُرائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے انھیں منع کیا۔ لیکن جب وہ نہ مانے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ پھر صحبت کے اثر سے وہ بھی ویسے ہی ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی۔ اس کے بعد حضورؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا ہرگز نہیں بخدا تم

بھی بچ نہیں سکتے۔ جب تک تم بھی ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق کے سامنے جھکا نہ دو۔"

لیکن حق گوئی کا یہ کام حکمت و خوبی سے کرنے کا ہے۔

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (النساء: ۴)

اور تو اُن کو نصیحت کر اور اُن سے دلنشیں بات کہہ۔

طاقتور کے لیے تو حق گوئی اس کے حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے کسی کو بھی تابِ انکار نہیں ہوتی۔ درحقیقت حق گوئی کا حقیقی جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ فرد کی طرف سے جماعت کے مقابلہ میں، شہری کی طرف سے ریاست کے مقابلے میں، مظلوم کی طرف سے ظالم کے مقابلے میں اور کمزور کی طرف سے طاقتور کے مقابلے میں کی جاتی ہے۔ اس وقت وہ ایک قابلِ تعریف اور قابلِ داد صفت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ حق گوئی کی مزاحم قوت خوف ہے اور خوف کی موجودگی اور اس کے علی الرغم سچی بات کہہ دینے کا نام ہی حقیقی حق گوئی ہے۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (مائدہ: ۸)

" اور یہ لوگ (اہل ایمان) کسی ملامت کرنے والے کی کسی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

اس لیے حضورؐ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا۔

" جب کسی کو کوئی حق بات معلوم ہو تو چاہیئے کہ اس کے کہنے سے انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔"

ایک اور موقعہ پر آپؐ نے فرمایا۔

" کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے، فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں حق بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا۔ وہ کہے گا کہ انسانوں کے خوف نے۔ ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔"

صحابہ کرام بڑے بڑے ہیبت ناک اور ظالم بادشاہوں کے درباروں میں بھی جاتے تھے تو ان دربار والوں کے کرداروں کو گڈے گڑیا کے کھیل سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ اسلامی ریاست کے سفیر بن کر

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ایران کے دربار میں گئے تو بھرے دربار میں سے گزرتے ہوئے سیدھے بادشاہ کے تخت پر جا چڑھے اور اس کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر بیٹھ گئے۔ درباریوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر انہیں تخت سے نیچے اُتار دیا تو اس پر وہ کہنے لگے "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگوں نے اپنے بادشاہوں کو خدا بنا رکھا ہے۔ ہمارا خلیفہ تو ہمارے درمیان ہمارے برابر بیٹھتا ہے"۔

حق گوئی کی اس تربیت کی خاطر ہی حضورؐ نے فرمایا تھا۔

"تم میں سے جو شخص بُرائی کو دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹا دینے کی طاقت رکھتا ہو تو اُسے ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے۔ لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"۔

حضورؐ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ میں یوں تو ایک ایک فرد عزیمت اور حق گوئی کا ہمالیہ تھا۔ لیکن حضرت ابوذر غفاری کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو پھر اُسے پوشیدہ رکھنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے تنِ تنہا جا کر حرمِ کعبہ میں توحید کا نعرہ بلند کر دیا اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے۔ اسی لیے حضورِ اکرمؐ نے اُن کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

"آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو اور کوئی نہیں ہے"۔

حضرت ابوسعیدؓ خدری بیان کرتے ہیں کہ حضورِ اکرمؐ نے ایک طویل خطبے میں فرمایا:۔

"ہوشیار رہنا، کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے"۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے فرمایا:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے رہو ورنہ یہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنا عذاب نازل فرمائے اور تم اُسے پکارتے رہو اور تمہیں جواب نہ ملے"۔

حضورؐ نے مزید فرمایا جسے حضرت عرس بن عمیرہ نے روایت کیا۔

"جس کی موجودگی میں بُرائی عمل میں لائی جائے اور وہ اُسے روکے تو اُس کی موجودگی بھی غیر موجودگی کے برابر ہے اور جو اس بُرائی سے راضی رہا اور نہ ٹوکا تو اُس کی غیر موجودگی بھی موجودگی کے برابر

شمار ہو گی۔"

اعانتِ حق کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا۔

"جس کسی کے سامنے اس کے بھائی مومن کی تذلیل ہو رہی ہو اور وہ امداد کی قدرت رکھتا ہوا بھی اس کی مدد نہ کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے اُسے رسوا کرے گا۔"

نیکی کا حکم دینے اور بُرائی کے تدارک کی کوشش کرنے کو اتنی اہمیت دی گئی کہ حضورؐ نے یہ رعایت تک فرمائی کہ اگرچہ کہنے والے کا نیکی پر عمل اور بُرائی سے اجتناب کامل نہ ہو تو بھی اُسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے مسلمانوں میں ایک گروہ کا مستقل وجود ضروری قرار دیا گیا جو مستقل طور پر امت میں نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے بچنے کی پیہم تلقین کرتا رہے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران: ۱۰۴)

ترجمہ۔ تم میں سے ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔"

اور اگر پوری اُمت میں کوئی بھی حق گوئی کا فریضہ انجام نہ دے رہا ہو تو پوری اُمت گنہگار قرار پاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"نیکی کا حکم دیا کرو، ورنہ تم سے بدتر مخلوق تم پر حاکم بنا دی جائے گی اور پھر تم میں سے بہتر اشخاص کی دُعائیں بھی قبول نہ ہوں گی۔"

حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"تمام شہیدوں میں سے افضل شہید وہ ہے جو ظالم بادشاہ سے احتساب کرے اور پھر اس میں مارا جائے۔"

چنانچہ قرآن نے حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے تلقینِ حق کے کام کو عزم الامور میں سے قرار دیا ہے۔ یعنی کٹھن اور نہایت درجہ عزیمت کا کام جس کے راستے میں تکلیف پہنچتی ہے اور جو راستہ صبر سے ہی طے ہو سکتا ہے اس لیے کہ دراصل یہ انبیاء کا راستہ ہے۔ جس پر باہمت صالحین ہی چل سکتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں۔

" میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چند امور خیر کی وصیت کی۔ مجھے نصیحت کی کہ خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈروں اور مجھے نصیحت کی کہ حق بات کہوں خواہ وہ کڑوی ہی کیوں نہ لگے "۔

حضرت عمرؓ فاروق نے حضورؐ اکرم سے روایت کی کہ حضورؐ نے فرمایا۔

" یقیناً آخر زمانہ میں میری امت کو ان کے بادشاہوں کی جانب سے سختیاں لاحق ہوں گی۔ اس سے وہی شخص نجات پائے گا جس نے خدا کے دین کو پہچانا اور اس کے لیے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے جہاد کیا۔ پس یہی شخص ہے جس کے لیے دنیا و آخرت کی سعادت آگے بڑھے گی "۔

حق گوئی پر ابھارتے ہوئے حضورؐ نے مزید فرمایا۔

" جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر رہی ہے تو سمجھ لو کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے "۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی حفاظت اس پر سے اٹھالی گئی ہے)۔

اس طرح حضورؐ اکرم نے اپنے قائم کردہ اسلامی معاشرے میں نیکی کو پروان چڑھانے، برائی کا قلع قمع کرنے اور تبلیغ (دین) حق کا سلسلہ جاری رکھنے کا ایک مستقل انتظام فرما دیا۔ آپ نے حق کی حمایت اور باطل کی مزاحمت کو اس امت کے فرد فرد کے مزاج میں راسخ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم معاشرے کے اندر نیکیوں کے لیے فضا سازگار ہو گئی اور برائیوں کے لیے ماحول تنگ ہو گیا۔ اس کے ذریعے معاشرے کی مستقل قدریں وجود میں بھی آئیں اور محفوظ بھی ہو گئیں۔ اور ان قدروں کی حفاظت معاشرے کے فرد فرد کا فریضہ ٹھہرا۔ اس طرح حضورؐ کا قائم کردہ اسلامی معاشرہ ان پائیدار اخلاقی قدروں پر قائم ہو گیا جو تا قیامت ناقابلِ تغیر ہیں۔ پھر حق گوئی کے ذریعے ان قدروں کی حفاظت کا مستقل انتظام بھی کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی حق گوئی اور حق پرستی کا ریکارڈ انسانی تاریخ میں اتنا درخشاں ہے کہ جس کی مثال دنیا کی کسی دوسری سوسائٹی کے پاس موجود نہیں ہے۔

پاکستان کی نظریاتی اساس — دعوے اور عمل

محمد نواز - ایم - اے

پاکستان کا قیام تاریخِ عالم میں معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ و سیاست کا کوئی طالب علم اس بات کی توجیہ پیش نہیں کرسکتا کہ برصغیر کے مسلمان نسل و زبان کے اختلاف کے باوجود کیونکر متحد ہوئے اور برصغیر کے دو کناروں سے جغرافیائی بُعد کے باوجود باہم مل کر ایک ملک کیسے بنے۔ دنیا میں قومیں رنگ، نسل، زبان اور وطن کی بنیاد پر وجود میں آتی رہی ہیں لیکن متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ان میں سے کسی بنیاد کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے رنگ و نسل اور زبان و وطن کی قیود کو توڑ کر انگریز اور ہندو کی مخالفت کے علی الرغم خالصتہً نظریاتی اساس پر پہلے اپنا قومی تشخص قائم کیا اور پھر اسی بنیاد پر پاکستان جیسی عظیم مملکت حاصل کی۔

اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر نظریہ کی طاقت پشت پر نہ ہوتی تو نہ محمد علی جناح قائداعظم بن سکتے، نہ مسلم لیگ کو مسلمانوں میں کوئی قابلِ قدر مقام حاصل ہوتا اور نہ پاکستان ہی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا۔ پاکستان کو نہ تو کسی فوج نے فتح کرکے حاصل کیا تھا۔ اور نہ یہ کسی قوم کی مادی قوت کے بل بوتے پر قائم ہوا تھا بلکہ معاشی اعتبار سے انتہائی قلاّشی اور عسکری لحاظ سے مقابلتاً ایک کمزور قوم نے محض نظریہ اور نصب العین کی طاقت سے یہ ملک حاصل کیا۔ مادی ساز و سامان کے بالمقابل ایک عظیم نظریہ نے اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور یہ بات صفحۂ تاریخ پر ثبت کردی کہ تاریخ میں فیصلہ کن انقلابی عامل مادی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتا ہے۔ نظریہ افراد میں آہنی عزم و ارادہ جیسی ناقابلِ تسخیر قوت پیدا کرتا ہے، نظریہ ہی قوموں کی تخلیق اور قوت کا سبب بنتا ہے۔ جس طرح بجلی کی رَو بے جان تاروں کو توانائی بخشتی ہے اسی طرح نظریہ افراد اور قوموں میں جہانگیری اور جہاں آرائی کی قوت و صلاحیت پیدا کرتا ہے اور یہ نظریہ ہی کا فیض تھا کہ جس نے

پہلے برصغیر کے منتشر اور کمزور مسلمانوں کو ایک بڑے سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر کے انہیں متحد کیا اور پھر انہیں انگریز اور ہندو کی متحدہ قوت سے ٹکرانے اور اُسے شکست دے کر پاکستان جیسی عظیم مملکت حاصل کرنے کے قابل بنایا۔

وہ نظریہ کیا تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں میں یہ حیرت انگیز طاقت پیدا کی تھی؟ اس نظریہ کی وضاحت سب سے پہلے کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم چوہدری رحمت علی نے ان الفاظ میں کی تھی:

"ہمیں اس باب میں کوئی غلطی نہ کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ ابھی طے کیا جائے ورنہ کبھی طے نہ ہو گا۔ یا تو ہم زندہ رہیں گے یا دائمی طور پر ختم ہو جائیں گے ہمارا مستقبل دیوتاؤں کے ہاتھ میں نہیں خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہیں۔ صرف ہم ہی اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں اور ہم ہی اُسے تباہ کر سکتے ہیں۔ گذشتہ ایک صدی کی تاریخ ایک انتباہ ہے اور یہ انتباہ نہایت واضح ہے۔ کیا ہمارے متعلق یہ کہا جائے گا کہ ہم نے تنبیہوں کو نظر انداز کر دیا۔ وفاقِ ہند کی خاطر اپنی قدیم قومیت سے غداری کے مرتکب ہوئے اور پورے برصغیر میں اپنے اسلامی ورثے کو ...... تباہ کر دیا۔"[1]

علامہ اقبال رحمہ اللہ علیہ نے پاکستان کی نظریاتی اساس کی واضح طور پر نشاندہی فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں ایک آزاد مسلم ریاست کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے قائداعظم مرحوم کو لکھا تھا کہ:

"لیگ کے سارے مستقبل کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کے افلاس کی اس مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو عام مسلمان پہلے کی طرح اب بھی اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید تصورات کے پیشِ نظر اس کے (یعنی اسلامی شریعت کے) مزید ارتقاء میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور اسلامی قوانین کے طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی قانون پوری طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے حق کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور اس کا ارتقاء

---

[1] جی الانا ـــــ قائداعظم محمد علی جناح ص ۳۶۹۔

ایک یا ایک سے زائد مسلم ممالک کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔"[۲]

"ان مسائل کو مسلم ہندوستان میں حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کو از سر نو تقسیم کیا جائے اور ایک یا ایک سے زائد ایسی مملکتیں قائم کی جائیں جہاں مسلمانوں کی کامل اکثریت ہو۔"[۳]

کانگریسی علماء کے "وطنی قومیت" کے تصور پر تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:-

"نظریۂ وطن ایک معنی میں وہی حقیقت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ ختمیت کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابداً آباد تک متعین اور متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کے اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کامل اور اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔"[۴]

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے تقسیم ملک سے قبل نظریہ پاکستان کی ان الفاظ میں وضاحت کی تھی:-

"ہمارے وجود کی اساس اسلام ہے - ہم ایک ہیں اور ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے آگے بڑھنا چاہیے، یہی صورت ہے جس سے ہم پاکستان کو قائم رکھ سکتے ہیں۔"[۵] (مارچ ۱۹۴۳ء)

"پاکستان کا منشاء و مقصد صرف آزادی اور خود مختاری نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے جو ایک بیش بہا عطیے اور خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچتا ہے جس کو ہمیں قائم اور برقرار رکھنا ہے اور جس کی بابت ہمیں توقع ہے کہ دوسرے بھی اس سے متمتع ہوں گے۔"[۶] (جون ۱۹۴۵ء)

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ضابطۂ حیات، اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں جو ہمیں خود مختاری حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھاتے ہیں۔"[۷]

(نومبر ۱۹۴۰ء)

---

۲ تا ۳ LETTERS OF IQBAL TO JINNAH - 28TH MAY 1937 - P-18

۴ تا ۷ پروفیسر خورشید احمد - پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ صفحہ ۹۸ و ۱۰۸

" لیگ اس بات کی دعویدار ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں۔ ایسی مملکت قائم کریں جہاں وہ اسلامی قوانین کے تحت حکومت کر سکیں"۔[9]

(دسمبر ۱۹۴۰ء)

تحریک پاکستان کی اس نظریاتی اساس پر سر ظفر اللہ خان قادیانی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا:

" جہاں تک ہم نے غور کیا ہے یہ اسکیم ناقابلِ عمل ، موہوم ، بے بنیاد اور خام خیال معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مقصد محض صوبوں کا وفاق بنانا ہے"۔[10]

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قائد اعظم کے یہ اعلانات محض سیاسی حکمت عملی کا درجہ رکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے موقف پر قائم نہ رہے تھے اور پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے حق میں نہ تھے۔۔ قائد اعظم مرحوم کے بارے میں جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں وہ دراصل ان کی عظمت کو کم کرتے ہیں۔ کیا اُن کے بارے میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ساری عمر تو وہ مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین کی طرف بلاتے رہے۔ اور اس نصب العین کی خاطر اُن سے قربانیاں طلب کرتے رہے لیکن جب ملک حاصل ہو گیا تو وہ خود اپنے اس نصب العین ہی سے منحرف ہو گئے۔ یہ بات کسی شاطر شخص کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے ، لیکن کسی دیانت دار ، با اصول اور صاحب کردار شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جو لوگ اس بات کو قائد اعظم سے منسوب کرتے ہیں وہ دراصل خود قائد اعظم مرحوم کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قائد اعظم مرحوم نہ صرف قیامِ پاکستان سے قبل بلکہ اس کے بعد بھی بڑی مضبوطی سے اپنے موقف پہ قائم رہے اور بڑی شدومد کے ساتھ اسے بار بار دہراتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی تقاریر کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

" قیامِ پاکستان کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اپنے لیے مملکت قائم کرنا ہی ہمارا مقصود نہیں تھا بلکہ یہ ذریعہ تھا حصولِ مقصد کا۔ خیال تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت ہوں جہاں اسلام کے عدل و مساوات کو آزادی سے بروئے عمل لانے کا موقع حاصل ہو"۔[11]

---

[9] رئیس احمد جعفری ، خطبات قائد اعظم صفحہ ۵۰۵

[10] شریف الدین پیرزادہ۔ پاکستان منزل بہ منزل صفحہ ۱۷۴

[11] ماہنامہ طلوع اسلام کراچی مئی ۱۹۴۸ء۔

"پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم ہو جو ہمیں اسلام نے دیئے ہیں[12]۔"

"میرے خیال میں مسلمانوں کا طرز حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصل کر دیا ہے ...... اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ قانون بنانے والی جماعت جس میں بہت زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی پاکستان کے لیے ایسے قانون بنا سکے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہوں اور یہ پاکستانی غیر اسلامی قانون پر عمل کر سکیں گے[13]۔"

"وہ صرف یہی نہیں کہ ہم میں سے اکثر مسلمان ہیں بلکہ ہماری تاریخ ہے، اپنے رسم و رواج ہیں اپنی روایات ہیں، اپنا انداز فکر ہے اور اپنا مخصوص رجحان ہے جس سے احساس قومیت پیدا ہوتا ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہم سکون کے ساتھ اپنے انداز پر مستقبل کی صورت گری کریں اور دنیا کے معاملات میں اپنے حق کے مطابق حصہ لیں[14]۔"

"اس اسکیم کے پیش کرنے میں بنیادی اصول میرے پیش نظر تھا یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات اسی میں مضمر ہے کہ ہم ان بیش بہا اصولوں کی پیروی کریں جو ہمارے عظیم المرتبت قانون دہندہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع فرمائے تھے۔ آیئے ہم اپنی جمہوریہ کی اساس سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر قائم کریں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے امور حکومت باہمی مشوروں سے طے کریں[15]۔"

یہ تھا وہ نظریہ پاکستان جسے قائد اعظم نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ جس کی دعوت پر برصغیر کے مسلمان جمع ہوئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ہر دور کے مسلمانوں اور سیاسی رہنماؤں نے قوم کے سامنے اسی نظریہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے اس نظریہ پر جن الفاظ میں روشنی ڈالی وہ حسب ذیل ہیں:۔

---

۱۲ روزنامہ امروز کراچی ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء

۱۳ پروفیسر خورشید - پاکستان میں آئین کی تدوین - ص ۷۱ -

۱۴ تا ۱۵ پروفیسر خورشید احمد - پاکستان میں آئین کی تدوین ص ۱۰۹ -

"پاکستان اس غرض کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم ریاست کا نمونہ دکھایا جائے"۔[۱۶]

"جہاں تک لوگوں کی اُمنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت چلائی جائے۔ اس کے لیے دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قرار داد مقاصد کافی ضمانت ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا .... ہم دنیا کو یہ دکھانے کا داعیہ رکھتے ہیں کہ فقط اسلام ہی وہ اصول زندگی ہے جو دنیا کے موجودہ مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے"۔[۱۷]

"پاکستان بس ایک اور صرف ایک ہی آرزو رکھتا ہے اور وہ آرزو ہے خدمتِ اسلام اور خدمت بنی نوع انسان ...... میرا یہ محکم یقین ہے کہ آج دنیا جن مشکل مسائل سے دوچار ہے ان کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مذہب اور دوسرے کو دُنیا کے حوالے نہیں کرتا وہ اپنے پیروؤں کی پوری زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی .... اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے .... وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالے کر دینا اس کی تعلیم ہے"۔[۱۸]

"ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا۔ اب ہمیں اُسے پورا کرنا ہے اور ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے۔ جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو .... دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے"۔[۱۹]

لیاقت علی خان مرحوم نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے قرار داد مقاصد پاس کرائی۔ اس قرار داد مقاصد نے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو اسلامی ریاست کا درجہ دے دیا۔ اس کے پاس ہو جانے کے بعد ملک کے تمام اسلام دوست حلقوں نے پاکستان کو مسجد کی مانند محترم قرار دیا اور بیرونِ ملک کے

---

۱۶ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء

۱۷ پاکستان ٹائمز لاہور ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

۱۸ ڈان کراچی ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء

۱۹ نوائے وقت لاہور ۸ جنوری ۱۹۵۰ء

مسلمانوں نے خوشی منائی - انڈونیشیا کی خواتین نے روزے رکھے اور مصر کے نوجوانوں نے نمازِ شکرانہ ادا کی -

قرار دادِ مقاصد واقعتاً اس ملک کے مسلمانوں کے اجتماعی ارادے اور اُمنگ کا اظہار تھی - اس نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ تحریکِ پاکستان بے مقصد نہ تھی بلکہ اس کا ایک مقصد تھا اور وہ مقصد بھی کوئی معاشی یا مادی نوعیت کا نہ تھا -

لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین مرحوم کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں جو دستور کا مسودہ پیش کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس مسودہ کو مارچ ۱۹۵۳ء میں آئین کی صورت میں نافذ کر دیا جائے گا - اس میں بھی قرار دادِ مقاصد شامل تھی - پھر یہ قرار دادِ مقاصد ۱۹۵۴ء کے اس آئین میں بھی موجود تھی جسے وزیرِ اعظم پاکستان محمد علی بوگرہ نے ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی سے پاس کرایا تھا اور یہ قرار دادِ مقاصد ۱۹۵۶ء کے اس آئین میں بھی موجود تھی جسے قوم نے متفقہ طور پر قبول کیا تھا -

جب ۱۹۵۸ء میں ملک کا دستور ختم کر کے مارشل لاء نافذ کیا گیا تو پاکستان کے چیف جسٹس نے قرار دادِ مقاصد کی تنسیخ کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کی دستوری اور قانونی حیثیت کو بحال کر دیا تھا - چیف جسٹس کے اس فیصلہ کو مارشل لاء کے چیف ایڈمنسٹریٹر صاحب بھی چیلنج نہ کر سکے بلکہ اُلٹا انہیں یہ کہنا پڑا کہ:

> "حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا تصور جو ایک تاریخی، ذہنی اور ولولہ انگیز نظریہ رکھتا تھا وہ نظریہ ہے جو اسلام نے ہمیں دیا اور جو بیک وقت انسانی، کائناتی، نظریاتی اور عملی اس دنیا کا اور دوسری دنیا کا تھا اس کا تعلق دل سے بھی تھا اور دماغ سے بھی - ایمان سے بھی تھا اور عقل سے بھی، جماعت سے بھی تھا اور افراد سے بھی - یہ ہے وہ جہاں سے ہم نے آغاز کیا - اور جہاں ہم کھو گئے - اب ہمارا یہ کام ہے کہ ان قدروں کو دوبارہ حاصل کریں جو کھو گئی ہیں اور ان کا انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کی حقیقتوں پر اس طرح اطلاق کریں کہ وہ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی سائنس اور فلسفہ کی روشنی برداشت کر سکے"۔[لے]

لے خطبہ تقسیم اسناد پنجاب یونیورسٹی ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء

" اگر ہم اسلام کو سچا دین اور اس کے قوانین کو اٹل قوانین سمجھتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ عصر حاضر کے تقاضے کبھی اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے، اسلامی قوانین سے وہی خوفزدہ ہیں جو بزدل ہیں۔[۲۱]"

" یاد رکھیے پاکستانی قومیت کی بنیاد اسلام اور محض اسلام ہے۔ اگر ہم نے اسلام کا دامن چھوڑ دیا تو بتائیے ہم میں اور آپ میں کونسا رشتہ باقی رہ جائے گا ...... پاکستان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں جس قدر جذبہ ایمان ہم میں ابھرے گا اتنا ہی پاکستان مضبوط ہوگا۔ اور اسلام کو عزت اور سربلندی نصیب ہوگی۔[۲۲]"

" یہ ملک محض اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ ہم اسلامی نقطۂ نگاہ کے تحت اپنی زندگیوں کو خالص اسلامی نظام میں ڈھال کر دنیا کے روبرو پیش ہو سکیں، اخلاقی اور روحانی میدان ہی میں آگے بڑھنے سے ہم اس ملک کو بام ترقی پر پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں ان وعدوں کو نبھانا ہے جو قیام پاکستان کے موقع پر ہم نے دنیا کے سامنے کیے تھے۔ آؤ اللہ کا نام لے کر ہم اسلام کی صحیح قدروں پر آگے بڑھیں۔[۲۳]"

مارشل لا کے ناظمِ اعلیٰ محمد ایوب خان مرحوم نے ۱۹۶۱ء میں عید الاضحیٰ کے موقع پر قوم کو جو پیغام دیا تھا وہ یہ تھا:

" اچھی طرح یاد رکھیے کہ دنیا کا کوئی ملک اسلام پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر پاکستان اگر خدانخواستہ دوسرے ملک اسلام کی راہ سے منحرف ہونے کا فیصلہ کر لیں تو اس کا انجام اگلی دنیا میں جو ہوگا سو ہوگا۔ کم از کم اس دنیا میں وہ قوموں اور ملتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکیں گے مگر پاکستان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ہمارا یہ ملک اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے اور یہ اسی نام سے قائم رہ سکتا ہے۔ ہماری قومی وحدت اور استحکام کے لیے اسلام کے سوا اور کوئی بنیاد

---

۲۱ خطبہ تقسیم اسناد پنجاب یونیورسٹی ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء۔

۲۲ اقتباس از سرکاری پمفلٹ۔

۲۳ پروفیسر خورشید احمد۔ پاکستان میں آئین کی تدوین ص ۱۴۰ ۔ (۲۵ فروری ۱۹۵۹ء)

نہیں اور اپنے نظریہ کے متعلق زبانی جمع خرچ سے یہ قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمارے لیے اپنے نظریہ کو اور نہیں تو اپنے وجود کی بقا کے لیے عملی جامہ پہنانا ضروری ہے۔ ہمارے ایمان اور عمل میں جتنی زیادہ ہم آہنگی ہوگی اتنا ہی پاکستان قوی ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے قول اور عمل میں تضاد واقع ہوگا تو اس امر کا ہر وقت اندیشہ ہے کہ پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی اور پاکستان کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ پس روحانی اور اخلاقی مقاصد کی خاطر نہیں تو کم از کم خالص دنیوی اور مادی نقطۂ نگاہ سے اپنی بقا کی خاطر ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم اپنے مقدس دین کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہیں۔"[۲۴]

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے کتنے زریں خیالات تھے اس شخص کے جس نے فوج کی مدد سے اپنی قوم کو اپنا غلام بنایا۔ قوت و طاقت کے بل بوتے پر پورے دس سال تک ملک پر مسلط رہا اور عملاً پاکستان کی نظریاتی اساس پر پیہم وار کرتا رہا۔ (باقی)

ایشیا، لاہور ، جون ۱۹۶۱ء

(بقیہ اشارات) کبر و خود بینی سے دُور، خوگر سکوت اور انکسار پسند ——— مگر ان اوصاف کا ایک ایسا صحت مند نمونہ جو فکری دائرے میں باطل کے خلاف بغیر کسی مداہنت و رعایت کے مصروفِ پیکار رہتا۔ نہ اس نے ترکِ ستیزہ کی راہ اختیار کی، نہ جمود و یاس کی پرچھائیں اپنے اُوپر پڑنے دی۔

سچے مسلمان کا مسلک خدا کی عبادت کے ساتھ اس کے بندوں کی خدمت سے عبارت ہے۔ ان کے سلوکِ خدمت کے مظاہر کئی تھے۔ اپنے ذوی القربیٰ میں سے کسی کو بھی مالی تکلیف کا سامنا ہوتا تو وہ اس تکلیف کو اپنے کھاتے میں ڈال لیتے۔

رشتہ داروں سے باہر بھی بعض اہلِ احتیاج کے لیے انہوں نے چھوٹی چھوٹی رقوم بطور وظیفہ مقرر کر رکھی تھیں۔ مرنے سے دو ایک روز پہلے ایسے ہی ایک شخص کو اس کا "حق معلوم" ادا کیا۔ بہت سے طلبہ کی فیسوں کی ادائیگی یا کتابوں کی خریداری کے لیے اُن کی طرف سے باقاعدہ مدد ملتی، اور اس کام کے لیے بعض مخیر حضرات اُن پر پورا اعتماد رکھنے کی وجہ سے چپکے سے رقوم اُن کے حوالے کر جاتے تھے۔ وہ آمد و خرچ کی تفصیل اپنے پاس نوٹ کر لیتے تاکہ جب کوئی چاہے حساب دریافت کر لے۔ گوجرانوالہ سے لاہور کے درمیان سفر کرتے ہوئے وہ کبھی تو حلقۂ درسِ قرآن کا اہتمام کر لیتے، اور کبھی کالجوں کے ہم سفر طلبہ کو (جن میں سے اکثر پروفیسر صاحب کو جانتے تھے) اُن کے اسباق سمجھانے اور ان کی مشکلات حل کرنے میں مدد دیتے۔ گویا یہ متحرک سفری درس گاہ ہوتی۔ خدمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بسا اوقات بابو ٹرین کے الھڑ مزاج نوجوان مسافروں کے درمیان کوئی اکا دکا خاتون گھر جاتیں اور انہیں تنگ کیا جاتا تو وہ اگر کبھی گارڈ سے شکایت کرتیں تو وہاں سے بتایا جاتا ہے کہ اس گاڑی میں صرف ایک جگہ ہے جہاں تمہارا تحفظ ہو سکتا ہے ——— وہ کمپارٹمنٹ جس میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی بیٹھتے ہیں۔ اور ان کا کمپارٹمنٹ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاک دل و پاک نظر آدمی کہاں بیٹھتا ہے۔ اور خدمت کی ایک راہ یہ بھی تھی کہ تحریکی رفقا اور ذاتی دوست پبلک لائبریری میں کام لے کر اُن تک پہنچتے۔ کام اگر ایسے محکمے یا دفتر سے متعلق ہوتا جہاں پروفیسر صاحب کا کوئی سابق شاگرد کسی عہدے پر بیٹھا ہوتا ——— اور ایسے لوگ کئی محکموں میں تھے ——— تو وہ بلا تامل کام اس کے پاس بھجوا دیتے یا اگر مناسب آدمی ان سے لائبریری میں آکر ملنے والا ہوتا تو اس کی آمد تک ملتوی رکھتے۔

مرنجاں مرنج ہونے کا محاورہ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ کم سے کم میرے علم میں ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص سے ان کی تناتنی یا رنجش چل رہی ہو یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے انہوں نے کبھی سوچا تک بھی ہو یا کسی کے

لیے ایسے ناخوشگوار جذبات کا اظہار کیا ہو یا ایسے اذیت ناک الفاظ استعمال کیے ہوں کہ اُن کے نتیجے وہ چیز مستقلاً پیدا ہو جاتی ہے جسے غِلّ کہتے ہیں، اور جو بسا اوقات مرجانے کے بعد بھی نہیں چھوڑتی۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ اہل ایمان صالحین کو جنت میں لیا جائے گا تو اُن کے سینوں میں اگر کوئی غلط فہمی یا احساسِ اذیت یا منافرت وغیرہ کا شائبہ ہو گا تو اسے صاف کر دیا جائے گا۔ (وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ۔ الاعراف ۴۳ الحجر ۴۷)۔

بہ حیثیت انسان مرحوم رفیق کی بڑائی کی ایک علامت یہ ہے کہ مجھے جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو چند لمحوں کے لیے ان کی محبت و عنایت کی وجہ سے اپنے اندر عزت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ بعض لوگوں کے پاس آدمی بیٹھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ چھوٹا ہو گیا ہے، بعض کی ہم نشینی سے برابری کا تصور ملتا ہے، خاص خاص لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگرچہ بڑے وہ خود ہوتے ہیں، مگر وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں میں برتری کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ بڑا ہوتے ہوئے اپنے رویے سے چھوٹے چھوٹے ہم نشینوں کو بڑا بنا دینا، یہ ایک ایسا مقام ہے جو شاذ و نادر کچھ لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ عبدالحمید صدیقی اسی مقام پر فائز تھے۔

انسان اور انسان کے درمیان آج اتنی دیواریں کھڑی ہیں کہ لوگ مل بیٹھ کر بھی جدا رہتے ہیں۔ ہر شخص اپنی کچھ دیواریں ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ دیواریں دولت اور سٹیٹس اور معیارِ زندگی اور باہمی کشاکش اور بے اعتمادی اور حقیقی محبت کے بجائے محبت کی ایکٹنگ اور ڈپلومیٹک ازم اور تعلقات کو مطلب برآری کا ذریعہ بنانے کے مسالے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ یہ غیر مرئی دیواریں ان دوستیوں اور تعلقات اور ملاقاتوں کو اس اثر سے خالی رکھتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد باہم بھائی بھائی بن سکیں۔ خدا مغفرت سے نوازے پروفیسر عبدالحمید صدیقی کو جو اوّلین کلمۂ خطاب "بھائی جان" کہہ کر ان دیواروں کو کالعدم کر دیتے تھے۔ اور ان کا لہجہ بے حد ملائم اور غیر مصنوعی ہوتا۔

بہ حیثیت انسان ــــــ اور تحریکِ اسلامی کے انسان ــــــ کے اُن کا معیارِ ترجیح ہم لوگوں سے مختلف تھا۔ ہم مرکز سے متعلق رفیقوں میں سے شاید وہ مرتبۂ اوّل ملک غلام علی صاحب کو دیتے تھے کیونکہ وہ اُن کے علم و تقوٰی کے مقام سے آگاہ تھے۔ خود میری رائے میں پہلے نمبر پر ملک غلام علی صاحب اور دوسرے نمبر پر پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، اس لحاظ سے بڑی روشن مثالیں ہیں کہ دونوں نے برسوں کی کاوشوں سے اپنے علم میں نما اضافہ کیا کہ دونوں کی بات میں بڑا وزن پیدا ہوا۔ ملک غلام علی صاحب نے اگر جان ماری اور عرق ریزی نہ کی ہوتی

تو آج ہمارے درمیان ایک شخص بھی ایسا نہ ہوتا جو اصولی اور وقتی مسائل میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے دلائل اور حوالوں کے ساتھ دقیق رائے دے سکتا۔ کاش کہ دو چار لاکھ غلام ہمارے ہاں اور ہوتے۔ اور یہی بات پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی لوگ تحریکِ اسلامی کا اصل جوہر ہیں۔

ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں ان شاء اللہ علمی خدمات بھی انجام پائیں گی۔ کتابیں مرتب ہوتی رہیں گی، سیاسی معرکے جاری رہیں گے۔ مگر عبدالحمید صدیقی جیسا دوسرا آدمی مرحوم کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے ہمیں میسّر ہوگا یا نہیں —— کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ اسلامی کی قوت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہمارے اندر سے اخلاقی جگمگاہٹ رکھنے والے ایسے انسان مسلسل اُبھرتے رہیں جیسے عبدالحمید صدیقی تھے اور اُن کو اوّل درجے کی قدر و قیمت حاصل ہو۔ اگر یہ نہ ہوا تو پھر اگر فرمانروائی بھی مل جائے تو بھی تحریکِ اسلامی کے اصل مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔

مرحوم کی ایک خوبی اُن کا حلم اور صبر تھا اور یہ جوہر اتنا رچا بسا ہوا تھا کہ چال بھی دھیمی تھی۔ (یمشون علی الارض ھونا۔ الفرقان-۶۳) اور قال میں بھی ایسا ٹھہراؤ کہ "نرم دمِ گفتگو" کا اطلاق ہوتا تھا۔ آواز بھی متوسط سطح سے کچھ کم ہی رہتی۔ (واغضض من صوتک۔ لقمان ۱۹) خاص طور پر آدمی کے صبر و حلم کی جانچ مرحلۂ اختلاف میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنی "انا" کے دباؤ سے بھی بات بات میں اختلاف کرتے ہیں، اختلاف کو زور سے بیان کرتے ہیں، لفظوں میں بھی زور، لہجے اور آواز میں بھی زور۔ پھر چاہتے ہیں کہ لازماً اُن کی بات چلے، اور بات چل جاتے تو دل میں فتح مندی کا احساس اُبھرتا ہے۔ یہی پگڈنڈی ہے جو مناظرے اور مجادلے کی وادیوں تک لے جاتی ہے۔ ہمارے مرحوم بھائی اس معاملے میں بڑی مختلف ساخت کے تھے۔ اوّل تو کثرتِ اختلاف کا مرض نہ تھا۔ ہر چھوٹے موٹے اختلاف کو ہر قسم کے موقعوں پر میدان میں اُچھال دینے کی عادت نہ تھی، جہاں ضروری ہوتا وہاں اپنی رائے کے طور پر اختلاف کو عام لہجے میں مختصراً بیان کر دیتے۔ اور اُن کے جذبات کی فوجیں حرکت میں نہ آتیں۔ ان کی کوشش یہ نہ ہوتی کہ دوسروں سے کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوانا ہے۔ کسی نے کچھ سمجھ لیا تو بہتر، نہیں تو خوبصورتی سے بات کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیا۔ انسان میں لمحۂ اختلاف کی شائستگی کا پیدا ہونا بہت بڑی تربیتِ نفس چاہتا ہے۔ نفسانیت گفتگوؤں کے موقعوں پر پھنیر سانپ کی طرح دبک کر پس منظر میں موجود رہتی ہے۔ جونہی کوئی اختلافی بحث چھڑی وہ اچانک اپنا پھن پھیلا کے پھنکارتی ہوئی سامنے آجاتی ہے

پروفیسر عبدالحمید صدیقی کے اندر ایسا چھپیر سانپ تو کیا، کوئی حقیر سا سپنولیا بھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ بعض معاملات میں جزوی طور پر انہیں مجھ سے بھی اختلاف ہوا ہے، مگر اس کے ساتھ ان کی محبت اور اُن کے حسن ظن میں جو وہ میرے لیے رکھتے تھے کبھی فرق نہیں آیا۔ اختلاف انہیں دوسروں سے بھی ہوتے رہے ہیں، جماعت کے بعض اکابر اور بعض عہدہ داروں سے بھی، بعض پالیسیوں اور فیصلوں سے بھی، لیکن جس طرح ان کے "اشارات" پر ایسے کسی اختلاف کا پرتو موجود نہیں ہوتا تھا، اسی طرح ان کی طبیعت پر بھی کوئی مستقل اور گہرا اثر باقی نہیں رہتا تھا۔ نہ کسی کے لیے اُن کے دل میں مستقل ناپسندیدگی پیدا ہوتی، نہ کسی سے بُعد! کیا شان ہے ایک مخلص مسلمان کے قلب و ذہن کی! سبحان اللہ!

مرحوم کے لیے مغفرت کی دُعا کرنے سے پہلے میں تین ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں:

اوّلاً یہ کہ مرحوم نے اپنی بیوی اور بچیوں کی شکل میں جو ذمہ داریاں (LIABILITIES) چھوڑی ہیں، اُن کے ساتھ غالباً کوئی خاص اثاثہ نہیں چھوڑا ہوگا۔ یہ ذمہ داریاں درحقیقت اب ہم سب کی ذمہ داریاں ہیں۔ ایک بھائی تحریک اسلامی کی خدمت کرتے کرتے گھُل گھُل کر ختم ہوگیا ہے تو اب اس کے خلاء کو پُر کرنا ہم سارے بھائیوں کی ذمہ داری ہے۔ ساری تحریکی برادری ان ذمہ داریوں کی وارث ہے۔ اس سلسلے میں غالباً پہلے ہی سے کام ہو رہا ہوگا، اس لیے اس پر تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ثانیاً دو تین افراد مرحوم کی ذاتی لائبریری کی لسٹ بنائیں، اور ان میں سے گھر کے لوگ جو کتابیں رکھنا چاہتے ہوں اُن کے علاوہ بقیہ تمام کتب کی قیمت لگوا کر انہیں جماعت کی مرکزی (یا گوجرانوالہ) کی لائبریری کے لیے خرید لیا جائے۔

یہی حضرات ان کی مطبوعہ کتب کی لسٹ بھی بنائیں اور غیر مطبوعہ مسودات (اور اہم خطوط) کی فہرست تیار کرکے رائے قائم کریں کہ کونسی چیزیں علیحدہ یا کسی مجموعے کی شکل میں شائع ہونے کے قابل ہیں۔

پھر کسی ایک قابل اعتماد پبلشر سے بات کرکے ایسی شرائط پر تمام کتابوں اور مسودات کے حقوق اشاعت دیے جائیں جن کی رُو سے رائلٹی کی رقم کا بڑا حصّہ مقررہ ماہانہ اقساط کی شکل میں مرحوم کے لواحقین کو ملتا رہے، اور سالانہ حسابات کرنے پر اگر مزید رقم نکلے تو ادا کر دی جائے، ورنہ اگلے سال کی اقساط میں سے منہا کر لی جائے۔

ثالثاً کوئی دو ایک موزوں اصحاب اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں کہ مرحوم کی سوانح حیات کے ساتھ اُن کے

علمی کام کا مفصل جائزہ شائع کرائیں۔ اگر ضروری ہو تو اُن کے اہلِ خانہ اور اُن کے برادران، ان کے شاگردوں، اُن کے معاصر و دوست اساتذہ اور اُن کے پبلشرز سے انٹرویو بھی لیے جائیں۔ ان میں کوئی انٹرویو مستقلاً بھی لیا جاسکتا ہے، بقیہ کے مواد کو سوانح نگاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ ہم جدا ہونے والے ساتھیوں کو ایک ایک کرکے فراموش کرتے جائیں، یہاں تک کہ بعض اوّل درجے کی قیمتی شخصیتوں کا کبھی تذکرہ تک ہماری رسمی اور غیر رسمی مجالس اور جرائد و نگارشات میں نہ آئے۔ گویا جو اپنا دورِ عمر پورا کر جائے اُس کی پوری شخصیت کو وقت کے تیز رو دریا میں بہا دیا جائے۔ گذرے ہوئے ساتھیوں کے حق میں یہ طرزِ عمل موجودہ ساتھیوں پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔

بلکہ میری خواہش (جسے میں خود پورا کرنے کے قابل نہیں ہوں) یہ ہے کہ اُن ساری شخصیتوں کے تذکرے پر مشتمل ایک وقیع مجموعہ تیار کیا جائے جو اب تک ہم سے جدا ہو چکے ہیں (مثلاً "ساتھی جو جدا ہو گئے" جیسے کسی عنوان سے)۔

آخر میں ہم جدا ہونے والی مبارک روح سے یہ کہتے ہوئے کہ "ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ" خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بچھڑ جانے والے پیارے بھائی عبدالحمید صدیقی کو صدیقین و شہداء اور صالحین کے اُس گروہ میں شامل کرے جو انبیاء کے گرد جمع ہے۔ خدا اس نیک نہاد بندے کی قبر کو کشادہ اور منور کرے، خدا اسے شفاعتِ پیغمبرِ آخرالزماںؐ کی برکت سے مغفرت بغیر حساب نصیب کرے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے کام کو اس کے لیے صدقۂ جاریہ بنا کر ہر آن اس کے اعمال میں ثواب کا اضافہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تحریروں کی برکت سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایمان با عمل کی نعمت سے نوازے۔ وہ مرحوم کی وفات سے تحریکِ اسلامی میں پیدا ہونے والے خلاء کو بہترین شکل میں پورا کرے۔ وہ ہمیں اور جملہ رفقائے تحریک کو توفیق دے کہ ہم ان کی تحریروں اور اُن کی عملی مثال سے استفادہ کرکے بہتر مرتبے کے انسان بنیں۔ خدائے رحمٰن و رحیم صدیقی مرحوم کے لواحقین کے لیے خود بہترین سہارا بنے اور اُن کو اور اُن کے خاندان بھر کے اعزہ و اقربا کو اُن کے سے ایمان و علم اور اُن کے سے کردار و تقویٰ کا وارث بنائے۔ آمین!

ادارۂ ترجمان القرآن کا ہر فرد اس دُعا میں شریک ہے۔ قارئین کے وسیع حلقے سے درخواست ہے کہ آپ تمام اصحاب بھی مرحوم کے لیے نمازوں کے ساتھ خاص طور پر مغفرت کی دعا مانگیں۔

---

(۲)

انقلاب افغانستان ہمارے بالکل قریب واقع ہوا ہے، مگر خبروں اور معلومات کے لحاظ سے دیکھیں تو جیسے ہزاروں میل دور کا قصہ ہے۔ خبریں، بیانات، اعلانات، تصویریں اور رپورٹیں برابر چلی آ رہی ہیں، مگر اب تک نہ تو تمام جزوی تفاصیل کے بارے میں تیقن سے صحت و عدم صحت کا حکم لگایا جا سکتا ہے، نہ داستانِ انقلاب کی پوری کڑیاں نگاہوں کے سامنے ہیں، نہ یہی اندازہ ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ان وجوہ سے پوری طرح تبصرہ کرنے کا موقع ابھی نہیں آیا۔

صرف دو تین سبق آموز پہلوؤں کو اجمالاً پیش کیا جا رہا ہے۔

۱- ایک ایسا مسلمان ملک جس کی بھاری اکثریت میں اسلام سے اعتقادی، جذباتی اور روایاتی وابستگی باقی تھی۔ اس کا بہترین سامانِ تحفظ اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ مگر حکمرانوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو جامد مذہبیت کی شکل دے کر مسجدوں میں دھکیل دیا تھا۔ اجتماعی زندگی سے اس کا ذرا سا تعلق تھا بھی تو وہ چند پرائیویٹ سماجی تقاریب کی حد تک تھا۔ اس کی حکمتِ حیات، اس کے سیاسی و معاشی اصولوں اور اس کے تہذیبی تقاضوں کو بے جان اور رسم کر دیا گیا تھا۔ اس کی تحریکی انقلابی روح سلب کر لی گئی تھی۔ نظامِ حکومت اسلام سے آزاد تھا، قانون و تعزیرات کا ڈھانچہ اس سے آزاد تھا۔ معاش اور معاشرت اور تہذیب کی نشوونما اس سے آزاد تھی، تعلیم اور قومی مالیات اور دفاع کے دائرے اس سے آزاد تھے۔ ایسے حالات میں اسلام جیسی عظیم قوت ایک مسلمان قوم کو تاریخی آفات سے تحفظ کیسے دے سکتی تھی۔

افغانستان میں اگر اسلام تحریکی شان کے ساتھ کارفرما ہوتا، لوگ شعوری ایمان سے آراستہ ہوتے، افغانستان سے روشنی کی کرنیں پھیل کر باہر کے اسلامی اور غیر مسلم ممالک میں پہنچ رہی ہوتیں۔ باہر سے مسلم علماء اور غیر مسلم محققین اس سرچشمۂ حکمت سے استفادہ کے لیے آ جا رہے ہوتے، زندگی کے شعبوں کی اٹھان احکامِ قرآن اور سنتِ رسولؐ کی اساس پہ ہو رہی ہوتی تو کوئی غیر اسلامی نظریاتی قوت اپنے لیے آلۂ کار حاصل نہ کر سکتی۔ کہیں سے بھی آئے ہوئے ماہرین ایمان و اخلاق کے قلعے میں نقب نہ لگا سکتے۔ مگر اسلام کے ساتھ جو سلوک عرصۂ دراز سے بادشاہت نے روا رکھا تھا۔ اس کے انتقام کا سب سے پہلا نشانہ وہی بنی اور اس کے ساتھ وہ پوری قوم بھی ایک خوفناک آزمائش سے دوچار ہو گئی جو سالہا سال سے غیر اسلامی بادشاہت کے آگے سرافگندہ

چلی آرہی تھی۔ اور اُسے برطرف کرنے کے لیے اس کے پاس قربانیوں کی کوئی تاریخ نہ تھی۔

اس پہلو سے ایک اہم سبق دُنیا بھر کی مسلم اقوام اور اُن کی حکومتوں کے لیے موجود ہے، اور یہ سبق ہم پاکستانیوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم بھی عرصہ دراز سے اسلام کے ساتھ کھیل تماشا کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس کا حق ادا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ یہ عظیم قوت جو ہزار آفات سے ہمیں بچا سکتی ہے اُسے ہم نے اس قابل بننے ہی نہیں دیا کہ وہ ہمارے لیے فولادی قلعہ ہو۔ اب بھی تلافی کا وقت ہے اور بہت تھوڑا وقت ہے۔ اگر ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں تو شعوری ایمان کے ساتھ تحریک اسلامی کو اُبھاریں۔ اور اس کے زور سے جلد از جلد اسلامی نظام عدل و رحمت کو برپا کریں۔ ورنہ محض سیاسی چالوں اور سفارتی حیلوں حوالوں اور بڑی قوتوں کے گھٹنے چھونے سے قضا نہیں ٹل سکتی۔

۲۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اسلام سے ہٹ کر انسانوں کے ایجاد کردہ نظاموں اور تہذیبوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو بنیادی طور پر تعلیم و تلقین سے اپنا راستہ بناتے۔ بخلاف اس کے مکر و سازش اور جبر و بہیمیت ہی ان کا طریق کار رہا ہے۔ باطل نظریوں اور نظاموں کا یہی نشان ہے۔ مغربی مادہ پرستی ہم پر ٹھونسی گئی تو اس امپیریلزم کے ذریعے جس نے مزاحمت کرنے والی واحد مسلم قوم کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اب جن مسلم ممالک میں اشتراکیت کے تجربے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی بڑا خون خرابہ اور بڑا بے رحمانہ تشدد ہوتا رہا ہے۔ یہی حال انقلاب افغانستان کا ہے۔ نام تو جمہور کا لیا جا رہا ہے، جیسے کہ چند مہینوں اور ہفتوں سے جمہور کسی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے اور کوئی تحریک چلا رہے تھے۔ اور اب اُن کی مساعی برگ و بار لائی ہیں[1]۔

فوج کا ایک دھڑا اُٹھتا ہے (ساری فوج بھی یکسو نہ تھی) اور بے شمار افراد[2] گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں

---

[1] اس کی مثال ہمارے یہاں کی تحریک ۱۹۷۷ء ہے جس میں شہر شہر، قریے قریے عوام سڑکوں پر نکل کھڑے ہوتے۔ یہ بات خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے کہ اتنی بڑی تحریک کے لاکھوں افراد نے ظلم کو شکست دینے کے لیے ظلم سہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ خود ظلم اور تخریب اور تباہ کاری کی راہ اختیار نہ کی۔ یہ اس وجہ سے کہ تحریک نظام مصطفیٰ کے نعرے سے چلی تھی۔ اسلامی قوت کا راستہ ظلم نہیں صبر ہے۔

[2] نور محمد ترہ کی نے کل کی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ یہ تعداد صرف ستر ہے۔

شاہی خاندان کے معاملے میں بھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ صدر داؤد کی لاش کو گھسیٹے جانے کی خبر بھی آئی ہے۔ جانیں بچانے کے لیے چھپ جانے والے جن لوگوں کو بذریعہ اعلان انقلابی کونسل کے سامنے پیش ہونے کے لیے کہا گیا تھا، اُن کی ایک تعداد واپس آئی تو کسی تحقیقاتی کارروائی کے بغیر گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ انسانوں میں شرف انسانیت کا جو جوہر رکھا گیا ہے، وہ بھی کام نہ کر سکا۔

اور ساری دُنیا میں یہی ہو رہا ہے، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگ میں، اسرائیل میں (شروع سے اب تک) بھارت میں (فسادات کی صورت میں) قبرص میں (چند سال قبل کے واقعات) برما میں (مسلمانوں کے خلاف) غرض جدھر بھی دیکھیے، بالکل حیوانات کی طرح ظالمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ غیر اسلامی نظریات و تحریکات نے انسانوں کو ان روحانی و اخلاقی خوبیوں سے خالی کر دیا ہے۔ جن سے جوہر انسانیت تشکیل پاتا ہے۔ مادّہ پرستانہ ذہن کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور انقلاب لانے والوں کی اخلاقی سطح ویسی ہی ہو گئی ہے جیسی ہائی جیکروں، اکابر کو اغوا کر کے یرغمال بنانے والی تنظیموں اور تخریب کاروں کی ہوتی ہے۔

اُٹھا کر دیکھیے تاریخ کہ عیسائی فاتح بن کر بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمانوں پر کیا گذرتی ہے۔ اور اسی بیت المقدس میں سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بن کر داخل ہوتا ہے تو کیسا سلوک کرتا ہے عیسائی آبادی کے ساتھ۔ معلوم ہوا کہ جہاں اسلام کارفرما ہوتا ہے وہاں انسانی شرف کام کرتا ہے۔ اور جہاں کوئی دوسرا نظریہ اثر انداز ہوتا ہے وہاں شرفِ انسانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

بہیمانہ مظالم کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے، کیونکہ انقلابی حکومت کے سربراہ نور محمد ترکی نے اعلان کیا ہے کہ عوام کو چاہیے کہ وہ سابق حکومت اور نظام کے حامیوں کو گرفتار کرائیں۔ جوں جوں یہ لوگ گرفتار ہوں گے، ظلم کی چکی گھمر گھمر چلتی رہے گی۔ ان کارروائیوں کے اندر سے نہ جانے کس طرح اسلام برآمد ہو جائے گا، یا جمہوریت نمودار ہو جائے گی۔

سبق یہ ہے کہ مکر و سازش اور ظلم و بہیمیت کی راہ سے آیا ہوا کوئی بھی انقلاب انسانیت کو فلاح نہیں دے سکتا۔

۳۔ یہ بھی بڑی پیچیدہ بات ہے کہ جس حکومت کے تمام کے تمام عمائد کمیونسٹ ہوں، اس کا کمیونسٹ سربراہ یہ پالیسی بیان کرتا ہے کہ انقلابی حکومت، اسلام، جمہوریت اور فرد کی آزادی کے لیے کام

کرنا چاہتی ہے[۱]۔ اغلباً مسلمان ممالک میں کام کرنے کے لیے اب یہی گائیڈ لائن اوپر سے دی گئی ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے اصول پر انقلاب کے قامت پر کوئی بھی مناسب جامہ فٹ کر لیا جائے۔

بہرحال یہ ایک تضاد ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والی اکثریت اور ان کی قیادت کرنے والے ملایان قہستانی کو تھوڑا سا بہلا کر آہستہ آہستہ کام کیا جائے۔ سمرقند و بخارا کا بھی ایک تجربہ تھا، اور اب مصر اور صومالیہ کا بھی ایک تجربہ سب کے سامنے ہے۔ دیکھیے کہ افغانستان کا تجربہ کیسا رہتا ہے۔

تضاد جہاں تیزی وطراری کا آئینہ دار ہوتا ہے، وہاں یہ کمزوری کا بھی مظہر ہے۔

اگر افغانستان کی مذہبی اکثریت کو مطمئن کرنا ہو تو کمیونزم کی خدمت نہ ہو سکے گی، اور اگر کمیونزم کی خدمت کی جائے تو اسلامی اکثریت کو مسلسل کچلنا ہوگا۔

لیکن نور محمد ترہ کی صاحب نے کل کی پریس کانفرنس میں یہ جو فرمایا کہ یہ حکومت کمیونزم کی نہیں ہے اور اسلامی بنیادوں پر ہی ریاست کو حسب سابق چلائے گی، روس کی خصوصی سرپرستی میں نہیں جائے گی۔ کسی وقت انتخابات کرائے جائیں گے اور اغلباً حکومت کی کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ دوسری جماعتوں کو بھی کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ ان باتوں کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ذرا صبر سے دیکھا جائے کہ کیا رنگ جاتا ہے اور کیا آتا ہے۔

۴۔ افغانستان میں کمیونسٹ عنصر آہستہ آہستہ پرورش پاتا رہا۔ اس کی آبیاری باہر سے بھی ہوتی ہوگی صدر داؤد نے برسر اقتدار آنے میں اس عنصر سے مدد لی۔ گویا اسے اور مستحکم کر دیا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ صدر داؤد سے قیمت بھی وصول کرنا چاہتے تھے۔ صدر داؤد نے اس سے گریز کیا۔ نتیجہ انقلاب! اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عنصر کسی بھی ملک میں رہ کر یہ خدمت انجام دیتا ہے کہ جب موقع ملے قوم کو بیرونی نظریات کے تسلط میں دے دے۔ یہ لوگ شکار کو گھیر گھار کر نشانے پر لانے والے ہیں۔ یہ غلام سازی کا ایک سلسلہ ہے۔

اگر ایسا ہے تو ہر مسلم ملک کو پہلے سے فکر کرنی چاہیے کہ یہ عنصر مضبوط نہ ہونے پائے، ساز باز نہ کر سکے۔

---

[۱] دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں براہ راست کمیونزم یا کمیونسٹ حکومت یا کسی کا کمیونسٹ کہلا کر مقبول عوام ہونا ممکن نہیں۔

اہم اداروں میں نفوذ نہ کرسکے، اہم عہدوں پر قابض نہ ہو۔

غفلت کی جائے گی تو یہ پوری قوم کو ہائی جیک کرکے کہیں کا کہیں پہنچا دے گا۔

۴۔ افغانستان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہاں کمیونزم اپنے خاص قسم کے شعبدے بہت زیادہ دکھا سکے۔ نہ وہاں کوئی خاص صنعتی نظام ہے کہ اُسے قومی ملکیت میں لے کر مزدوروں کو کچھ دیر کے لیے یہ خواب دکھایا جائے کہ لو اب سب کچھ تمہارا ہے۔ نہ زرعی نظام ہی کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے، تھوڑی بہت زمینداری ہے، وہ انفرادی ملکیت کے تحت ہے، تھوڑی سی جاگیرداری بھی ہے۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ کچھ دیر انقلابی بگولوں سے کھیتوں کی خاک اُڑائی جاسکے۔ افغانستان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے غلّہ تک تو پیدا نہیں کرسکتا، دوسری ضروریات تو رہیں الگ۔

پس وہاں کمیونزم کا کھیل دکھانے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ رُوس کو توسیع پسندی کے معرکے کے لیے ایک اور "بنکر" مل جائے۔ سو وہ مل گیا ہے۔ روسی سفیر برائے پاکستان کے ارشادات کا لب و لہجہ دیکھ لیجیے جو انہوں نے افریشیا کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پاکستان کی نوآبادی کو احکام سنائے جارہے ہیں۔ اصل ہدف گرم پانی کی بندرگاہ کا حصول ہے (یہ سطور چھپنے جارہی تھیں کہ انٹرویو کی تردید آگئی)۔

۵۔ روس اور افغانستان کی سفارتی سرگرمیاں ہمارے یہاں کچھ بھی ہوں۔ مختلف لابیز کسی بھی طرح کام کریں، ہمیں کسی ہراس میں پڑ کر ایک ایسے اندیشے کو اپنے اُوپر خواہ مخواہ اوڑھ نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے کرنے کے جو صحیح کام ہیں وہ ہمیں کرنے چاہییں، اور بے سوچے سمجھے کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ نہ تو رُوس کے خوف سے کوئی حرکت کی جائے، اور نہ رُوس سے اُلجھاؤ پیدا کرنے کا کوئی سبب مہیا کیا جائے۔ ٹھنڈی میانہ رو اسلامی پالیسی ہی میں ہمارا بچاؤ ہے۔

دُوررس نظر سے دیکھا جائے تو جس دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام ہے اس کے چڑھاؤ کا دَور گزر چکا ہے۔ اب جبکہ اندر بھی آویزش ہے اور باہر بھی کھینچا تانی۔ اس کا اتار ہو رہا ہے۔ اور اس اتار کو شاید تیز رفتار بنانے میں عالمِ اسلام کی تحریکاتِ اسلامی کی وہ مقناطیسی لہریں بھی کام کر دکھائیں گی جو چاروں طرف موجود ہیں۔ پاکستان کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں کوئی خلل واقع ہوا تو پھر پوری دُنیا کے امن کا بحرِ الکاہل آپس ہی میں ٹکرانے والے کئی طوفان اُٹھا دے گا۔ پاکستان افغانستان کی طرح بند معاشرہ نہیں ہے۔

۶۔ اس انقلاب کے ساتھ مسئلہ پختونستان پھر سامنے آیا ہے۔ یہ ایک غیر متعین ہیولیٰ سا ہے ۔

افغانستان کی مختلف حکومتیں اسے استعمال کر کے رخصت ہو گئیں اور ۱۳۰ سال گذر گئے۔

اچھا ہو کہ ایک بار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلے پر کھلی بحث ہو اور پاک افغان سرحد کے دونوں طرف ریفرنڈم کرا کے دیکھا جائے کہ ہماری کتنی آبادی افغانستان میں جانا چاہتی ہے اور افغانستان سے کتنی تعداد ہمارے یہاں آنا چاہتی ہے اور دونوں کی تعداد وں کے مطابق کتنے کتنے مربع میل علاقے ادھر سے ادھر یا ادھر سے ادھر ملحق ہونے چاہییں۔

اتنا مبہم اور غیر متعین مسئلہ شاید کبھی وجود میں نہیں آیا۔ اور آیا ہو تو اتنی دیر زندہ نہیں رہا۔ جیسے یہ ایک غبارہ ہے کہ جب چاہا اس میں ہوا بھر لی۔ اور جب چاہا ہوا نکال کر غبارہ تہ کیا اور مال خانے میں رکھدیا۔

کاش کہ اسلامی اخوت اتنی بھی اہم ہوتی جتنا پختونستان کا غبارہ ہے۔

۷۔ روسی سفیر نے دوستوں کے مسئلے پر کھل کر بات کی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہے کہ ہم سے دوستی رکھنی ہے تو چین سے انقطاع کر لو، مصر اور سعودی عرب اور صومالیہ کو چھوڑ کر لیبیا اور ایتھوپیا سے تعلقات جوڑو، ایران اور ترکی سے کنارہ کر کے عراق اور شام سے ربط رکھو۔

مگر دوستیاں عرصۂ دراز کے تاریخی عمل سے عوام میں نشوونما پاتی ہیں۔ عوام میں جب کچھ ممالک اور اقوام کے لیے اُن کے رویّے کی وجہ سے محبت کے جذبات پیدا ہو جائیں تو کوئی حکومت رائے عام کے مزاج سے ٹکرانا پسند نہیں کرتی۔

کہتے ہیں کہ دوستی مساوی بنیادوں پہ ہوتی ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو روس بھی ہماری پسند و ناپسند کے مطابق تعلقات کا نقشہ کچھ نہ کچھ بدلے۔ کیا ایسا ممکن ہے، اگر نہیں تو ہر چہ بر خود نہ پسندی، بہ دیگراں میسند۔ اصول کوئی ایک ہونا چاہیے۔ اور اس کا اطلاق یکساں۔ کوئی اگر چاہے کہ تمام دوستیاں ہماری مرضی کے مطابق ہونی چاہییں تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دفتر خارجہ کا چارج ہمیں دے دو۔ پھر آخر دفتر داخلہ کو کیسے الگ رکھا جا سکے گا۔

۸۔ بنیادی طور پر ہمارے روس سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں، اور افغانستان تو برادر پڑوسی ملک ہے۔ ہم اختلاف تو کر سکتے ہیں، کوئی عناد نہیں رکھتے۔ ہمارا کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ نئے حالات و واقعات کے رُونما ہونے پر اپنے اپنے رنگ کے تاثرات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں دوستانہ سفارتی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی نفی نہیں کرتیں۔ پھر کیا یہ کافی نہیں ہے؟

(۳)

ایک صدمۂ جانکاہ کا سامنا کر کے دل مقام ہی رہے تھے کہ مزید ایک خبرِ غم اثر نے روح کے دروازے پر دستک دی۔ سارا قصرِ احساس لرز اٹھا۔[1]

ماہر القادری ایڈیٹر فاران ہم سے جدا ہو گئے! ایک چمکتا ستارہ آسمانِ ایمان و ادب سے اور ٹوٹ گرا۔ خانۂ ظلمت میں گھی کے چراغ جلے ہوں تو کیا عجب!

سفر پر نکلنے سے پہلے دو ایک بار ٹیلی فون پر میرے بارے میں بالواسطہ طور سے معلوم کیا کہ آیا مجھے بھی چلنا ہے یا نہیں۔ میری طرف سے انہیں شاید میرا جواب مل گیا ہو کہ مجھے تو طلب ہی نہیں کیا گیا۔ دل میں سوچا کہ اپنی شعر و شاعری بھی کیا، اور ہو بھی تو اپنے جذبہ و تخیل کے حباب مشاعروں کے تیز و تند طوفانوں میں کیا جگہ پائیں گے۔ وہاں تو صدفِ فن کے گوہر مقام پاتے ہیں، یا پھر چٹانوں اور پتھروں کو وزن ملتا ہے کیونکہ وہ گرم و سرد اور موافق و مخالف رووں سے بے نیاز جہاں کے تہاں جمے رہتے ہیں۔

دو ماہ پہلے انہیں انگلینڈ سے برمنگھم کی سیرت کانفرنس (۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء) کے لیے دعوت نامۂ شرکت ملا تھا۔ ماہر صاحب سفر اور سیر کا شوقِ فراواں رکھتے تھے۔ دعوت کو دل سے قبول کر کے وہ خوشی خوشی اپنے کام تیزی سے نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ ماہِ رواں کے علاوہ فاران کے مزید دو شماروں کے لیے مضامین جمع کر کے انہیں مرتب کر دیا۔ اسی دوران میں جدہ سے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا۔ خط میں لکھا کہ جدہ جا رہا ہوں، عمرہ و زیارات میں کچھ دن صرف کروں گا اور پھر اگر انگلستان سے ٹکٹ موصول ہو گیا تو آگے چلا جاؤں گا۔ مگر انہیں کسی اور ہی طرف آگے جانا تھا۔ وہ سمندر پار جانے کے بجائے حیاتِ ارضی کی سرحد کے اُس پار چلے گئے۔ اُدھر سے دعوت نامہ اور ٹکٹ پہلے آ گیا ؎

جدہ گئے، پھر آگے بڑھے صحنِ حرم گئے   پھر اور آگے نکلے تو سوئے ارم گئے

---

[1] اشارات کے جملہ صفحات کتابت ہو کر پریس جا رہے تھے کہ ماہر صاحب کی اچانک وفات کی اطلاع موصول ہوئی۔ دل کے تاثر نے مجبور کیا اور فوری طور پر یہ چند سطور مرحوم کے متعلق لکھی گئیں۔ اشارات کا پورا نقشہ بدل دیا گیا ہے۔ (ن۔ص)

حلقہ یاراں میں ماہر صاحب کی قدآور شخصیت کو بے حد مرکزی مقام حاصل تھا۔ وہ نہ صرف اوّل درجے کے شاعر تھے اور فن اور زبان و محاورہ کے رازدان، بلکہ مادہ پرستانہ دور نے لامقصدی ادب اور بدن پرست ادب کے جو محاذ پیدا کر دیے تھے اُن کے خلاف جہاد آرا رہے۔ اس دور کے مزاج میں ہر روایت میں اندھا دھند بغاوت، ماضی کے خلاف نفرت، اصولوں، ضابطوں اور قدروں کو توڑنے کے لیے ایک نفسیاتی ہیجانی کیفیت کی جو بدبلا پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف دین و اخلاق کی بنیادوں کو متزلزل کرتی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف تہذیبی اور لسانی معیاریت کو تباہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ماہر صاحب بھی دوہرا کام کرتے رہے دین و اخلاق کے تحفظ کا جہاد بھی جاری رکھا، اور زبان کو بگاڑنے اور فن کو خراب کرنے کی مہمات کے خلاف بھی بڑی جرأت سے معرکہ آرا رہے۔ دراصل وہ ایک ہی کام تھا جسے وہ دو محاذوں سے انجام دے رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے ہماری ادبی سرگرمیوں کا بڑا بھرم قائم تھا۔

دین کے تقاضوں سے حق کہنے میں بے باکی کی وہ ایک روشن مثال تھے۔ پاکستان میں کیسے کیسے مرد افگن دور گذرے ہیں، مگر ماہر صاحب کا قلم غلام محمد اور سکندر مرزا کے دور سے لے کر بھٹو صاحب کے زمانے تک سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق بڑی سلیس زبان میں کہتے چلے گئے اور بارہا حکومتوں کے اُٹھائے ہوئے انحرافی مباحث میں تحقیقی مضامین لکھے اور لکھوائے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی کوئی ایسی کتاب سامنے آئی جس میں دین کی کسی حقیقت کو مسخ کیا گیا ہو، یا بیجا طور پر حکومت کی خوشامد کے جذبے سے مسائل کو تاویل کے سانچے میں ڈھالا گیا ہو، یا فرقہ وارانہ نزاعات کی گھٹیا سطح پر کوئی نکتہ آرائی کی گئی ہو تو وہ ایک ایک پیرے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کی چیر پھاڑ کر کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے فکر و بیان کو اس طرح نمایاں کر دیتے کہ جیسے کسی محدب شیشے کی مدد سے جراثیم اور وائرس کو بڑا کر کے دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔

ماہر صاحب محض ایک ادبی دانشور ہی نہ تھے، بلکہ وہ تحقیق و مطالعہ کے ساتھ اقامتِ نظامِ حق کے لیے پیش آمدہ مسائل پہ مؤثر کلام کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی دستور، اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اسلامی تعلیم اور اسلامی حکومت کے لیے ملک میں جو تحریک اوائلِ قیامِ پاکستان سے چل رہی ہے اس میں ماہر صاحب کا بھرپور حصہ شامل ہے۔ یقیناً اُن کی یہ خدمت خدا کے ہاں وزن و قدر رکھتی ہے۔

ماہر صاحب جوانی میں صبح بنارس جیسی نظمیں لکھنے کے باوجود دل کے مسلمان تھے۔ اور نعت گوئی کی طرف طبعاً اُن کو رغبت تھی۔ ۱۹۵۴ء میں زیارتِ حرمین سے بہرہ مند ہوئے تو اُن کے اندر حمیتِ دین اور محبتِ رسولؐ

کے جذبات کو خاص نشو و نما ملی۔ اس سفر کی کیفیات کا اظہار انہوں نے "کاروانِ حجاز" میں کیا ہے۔ بعد میں یہ رنگ اُن کے اں روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اُن کے یہی مقدس جذبات اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے قبول ہوئے کہ بیماری کے کسی لمبے چکر میں پڑے بغیر اپنے قدموں سے چل کر جان جانِ آفرین کو سپرد کرنے کے لیے سرزمینِ حجاز میں پہنچے۔ مشاعرہ پڑھنے گئے تھے مگر وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ جنازہ پڑھے جانے کا مقام بیت اللہ شریف تھا تو اس کا وقت نمازِ جمعہ کے بعد مقرر ہوا۔ تدفین مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں ہوئی۔ علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اس شخص کو کیا مقام ملا۔

ہم اپنے نقصان کو دیکھ کر روتے ہیں، مگر جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا فیصلہ ہے، اس کی نگاہ خیرِ کل پہ ہے اور خیرِ کل ہی کے لیے اس کے کچھ قوانین اور سنن ہیں اور ہر جان کی اجل مسمّٰی ہے۔ ہم اُس کے سامنے پورے ایمان و اعتماد کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اپنے لیے مقامِ صبر و رضا چاہتے ہیں۔

ماہر صاحب باغ و بہار شخصیت تھے، بذلہ سنج، لطیفہ گو، نکتہ طراز، اپنی خاص طرزِ ترنم کے موجد، مشاعروں کے بادشاہ، خندہ جبین، احباب نواز، وسیع الروابط، رونقِ مجالس، علم سے بہرہ مند، مطالعہ کے خوگر، شائستہ اطوار، خطوط کا جواب دینے میں نہایت باقاعدہ، لباس اور رہن سہن میں سادگی پسند، غرور سے خالی، بعض معاملات میں بچوں کی طرح بھولے بھالے، اپنی بے اولادی کے تذکرے سے انتہائی مجتنب، اہلیہ کی وفات کے بعد خدمتِ دین و شعر میں پہلے سے زیادہ سرگرم، مرحوم کی کیا کیا خوبیاں عجلت میں لکھے ہوئے اس مختصر نوٹ میں بیان ہوں۔

ذاتی طور پہ مجھے ان کا خاص التفات حاصل رہا، اور میری کوتاہیوں اور غفلتوں کے باوجود اُن کی برادرنوازی میں فرق نہیں آیا۔

موجودہ شخصیتوں میں سے سب سے زیادہ محبت و احترام ان کے دل میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی موصوف سے اثر پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں وہ فلمی دائرے میں گیت لکھنے (۱۹۴۲ء) کے تجربے میں پڑے۔ اسی زمانے میں اس کام سے ان کے اندر الجھن پیدا ہوئی۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے خط و کتابت کی۔ اُن کے ایک خط کا یہ حصہ مجھے اب تک یاد ہے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اوسطاً دو ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو رہی ہے۔ اس خط کا جواب اغلباً مولانا ئے محترم نے میرے ہی ذریعے لکھوا کر بھجوایا تھا۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں فلمی کام چھوڑ دیا، بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلامی

مقاصد کو فن کی رُوح بنانے کا آغاز کر دیا۔ نئے دورِ شاعری میں ان کی ایک عام فہم مگر حقیقت کا عکس پیش کرنے والی نظم قرآن کی فریاد بہت مقبول ہوئی۔ بعد میں اسلامی دستور پر لکھی ہوئی ایک نظم جگہ جگہ مجالس میں پڑھ کر سُنائی جاتی رہی ہے۔

اپنی منزل، اپنا مقصد اسلامی دستور

اسی طرح جب سکندر مرزا کا مارشل لا لگا اور جماعت خلاف قانون قرار پائی تو پیرایۂ غزل میں انھوں نے مارشل لا کے آسیبی سائے میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ابتلا کو بڑی خوبی سے بیان کیا ؎

شکوۂ آسماں کرتے کرتے — رک گیا ہوں فغاں کرتے کرتے

عمر گذری ہے بادِ صبا کی — خدمتِ گلستاں کرتے کرتے

ہو نہ جاؤں بہاروں سے بھی بدگماں — اعتبارِ خزاں کرتے کرتے

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر سیاسی اور دینی دائروں سے جو حملے ہوتے رہے تھے، ان سب کا جواب دینے کے لیے قلم کو نیزے میں بدل لیتے۔ اور اس کی نوک سے مخالفانہ مواد کا ایسا ناقدانہ تجزیہ کرتے کہ لفظ لفظ بے جان ہو کے رہ جاتا۔ اسی کے ساتھ جب کوئی مقام ایسا ہوتا کہ مولانا کی کسی بات سے، خواہ وہ تفسیر اور فقہ سے متعلق ہو، یا زبان اور محاورے کے بارے میں، اختلاف ہوتا تو بے محابا اس کا اظہار کرتے، خط لکھتے، ملاقاتوں میں گفتگو کرتے، کبھی ان کے مخلصانہ دلائل سے مولانا متاثر ہو کر اپنی بات میں کوئی تبدیلی کر لیتے، اور کبھی ماہر صاحب کو قائل ہونا پڑتا۔ اور کبھی اختلاف اپنی جگہ برقرار رہتا۔ یعنی انتہائی محبت واحترام کے باوجود معاملہ اندھی عقیدت کا نہ تھا۔ مولانا مودودی نے ایسے ہی آدمی بنانے میں عمر کھپائی ہے۔ محبت کے باوجود اختلاف، اور اختلاف کے باوجود محبت و اتحاد۔

یہ شخصیت جس کی ولادت کیسر ضلع بلند شہر یوپی میں ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء (۱۳۲۴ھ) کو ہوئی اور جس کا تاریخی نام منظور حسین رکھا گیا، ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو تین بجے شب ہم سے جدا ہو گئی، اگلے دن نماز جمعہ کے ساتھ حرم شریف میں جنازہ پڑھا گیا اور مکہ کے جنت المعلی نامی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

رب غفور و ودود، ہمارے اس بزرگ و محبوب رفیق کی رُوح کو اپنی خاص رحمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین

(اضافہ از ابوالاعلیٰ) ماہر صاحب مرحوم میرے قدیم ترین دوستوں میں سے تھے۔ تقریباً پچاس سال پہلے میری اور ان کی دوستی کی ابتدا ہوئی تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ مجھ سے ان کی مخلصانہ محبت کے گواہ فاران کے صفحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اُن کی نیکیوں کو قبول اور لغزشوں کو معاف فرمائے، اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ایک تجویز

بھارت اور اس کے علاوہ بھی بعض ممالک میں ایک اسکیم "ڈرگ بنک" (یا دواؤں کا بنک) کے نام سے چلتی ہے۔ جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ شہروں میں تقریباً ہر گھر میں ٹیکے اور گولیاں اور دوسری ادویہ پڑی رہتی ہیں۔ کبھی تو اس وجہ سے کہ ڈاکٹر علاج تبدیل کر دیتے ہیں اور کبھی اس سبب سے کہ پوری ادویہ کے استعمال سے پہلے ہی علاج مکمل ہو جاتا ہے۔

ان ادویہ کو جمع کر کے غریبوں کے علاج میں لگایا جا سکتا ہے۔

اب تک دوسرے ممالک میں یہ اسکیم حکومتی انتظام سے چلائی گئی ہے۔ مگر پاکستان میں اگر جماعت اسلامی کا شعبۂ خدمتِ خلق اس کام کو سنبھال لے تو اخبارات میں وقتاً فوقتاً اشتہار دے کر، ہینڈبل تقسیم کر کے، جمعہ کے اجتماعات میں مساجد کے اندر اعلانات کر کے پبلک سے یہ اپیل کی جا سکتی ہے کہ جن اصحاب کے ہاں بچی بچائی سر بند ادویات پڑی ہوں، وہ فلاں فلاں مراکز میں پہنچا دیں یا پوسٹ کارڈ لکھ کر اطلاع دیں تو ہمارے کارکن خود گھروں پر جا کر وصول کر لیں گے۔

جمع شدہ ادویات کا جائزہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر (اور یونانی ادویہ ہوں تو مستند حکیم) کے ذریعے لیا جائے گا۔ اوّل یہ کہ آیا کوئی ٹیکہ یا دوا اپنی مقررہ میعاد ختم تو نہیں کر چکی۔ وہ اس حالت میں تو نہیں ہے کہ مشکوک ہو چکی ہو اور اس کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو یا فائدہ کی اُمید نہ ہو۔ پھر جن دواؤں کو ڈاکٹر یا حکیم صاحبان پاس کر دیں اُن کو گشتی اور قائم شفاخانوں میں موجود رکھا جائے اور اُن کی باقاعدہ فہرست تیار کر لی جائے۔ ایسے غربا جو دواؤں کی قیمت ادا نہ کر سکتے ہوں یا مہنگے ٹیکوں اور ٹیکوں کو بازار سے نہ خرید سکتے ہوں، ان کو ڈرگ بنک سے مفت دوائیں مہیا کی جائیں۔

(نعیم صدیقی)
